

ڈاکٹر محمد یونس بٹ

مزاح پر سی



مزاح پُرسی

75	علم فی کلوگرام	7	بابائے لطیفہ
79	دو لہوؤں کا ملک	11	ماہر امراض طوطا چشم
83	اداستان	15	بیگم ڈول اور بیگم ڈانواں ڈول
87	جملہ تیوریہ	19	بیوٹی سنڈروم
90	سراسر گذشت	23	مولانا زلزلہ
93	سر برہنہ مملکت	26	مسلح شاعری
97	دیوار خواتین	30	آہ لالت موسیقی
100	نعلین در بغلین	34	حسین ہوتا منع ہے
104	ملکہ افسانہ	38	ضرورت سر رشتہ
108	مسماۃ قوی یکجہتی	42	انتظار یہ
112	فرزند جیل	46	خواجہ سگ پرست
116	حقہ شاہی	49	بیارستان
120	کتابفیم	53	ملکہ غزل
123	در لڈکپ	56	HOLYDAYS INN
		60	و-زیر بیان
		64	حوا شمار ی
		67	ا-دہلی حکومت
		71	و-ردی



بابائے لطیفہ

عنوان سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہم نواب زادہ نصر اللہ خان کے بارے میں لکھنا چاہ رہے ہیں۔ اگرچہ ان پر لکھ کر ہمیں اتنی ہی خوشی ہوتی ہے جتنی ایک اچھا لطیفہ پڑھ کر۔ ایک بار ایک کتاب کے ٹائٹل پر صرف نواب زادہ کی تصویر دیکھ کر ہم نے اسے لطیفوں کی کتاب سمجھ کر خرید لیا اور بعد میں وہ سیاسی کتاب نکلی۔ ویسے بھی آج کل جتنے مشہور لطیفے ہیں۔ وہ سب سیاست میں ہی ہیں۔ سیاست ویسے بھی فنون ”لطیفہ“ میں شامل ہے۔ اس کے باوجود ہمارا یہ

کالم بابائے لطیفہ ملاضر الدین کے بارے میں ہے۔ یاد رہے یہاں ملاضر الدین سے مراد پیر پچازا نہیں ہے۔ دراصل ہوا یہ ہے کہ ایک افغان مصنف ادریس شاہ نے اپنی کتاب "The Sufis" میں ملاضر الدین کو بہت برا صوفی قرار دیا ہے۔ ہمیں یہ تو نہیں پڑا کہ ملاضر الدین کتنا پہنچا ہوا صوفی ہے۔ یہ پڑ ہے کہ وہ ہم تک ابھی پہنچا ہے۔ اور بس شاہ نے تو اس کا نام فرید الدین عطارؒ مولانا روم اور محسنؒ تہمیز جیسے صوفیوں کی فہرست میں درج کیا ہے۔ بات فہرست تک رہتی تو بڑی بات نہ تھی کہ ہم نے تو غالبؒ، میرؒ، اقبالؒ اور فیضؒ جیسے شاعروں کی فہرست میں ظفر اقبالؒ کا نام لکھا پڑا ہے۔ لیکن ادریس شاہ نے لطیفوں سے انہیں ایسے ہی صوفی ثابت کیا ہے جیسے ہم نواب زادہ نصر اللہ خان کو بابائے جمہوریت ثابت کرتے ہیں۔ اس سے اور کچھ ہو نہ ہو، ہمیں ملائے لطیفوں پر ہنسی آتا بند ہوگئی ہے۔ اب ہمیں وہ صوفیانہ کام لگنے لگے ہیں۔

دنیا میں غم اٹے ہو گئے ہیں کہ ہم سمجھتے ہیں سب سے بڑا موجود وہ ہے جس نے ہنسا ایجاد کیا۔ پال جاسن کی تحقیق کے مطابق دنیا کے ریکارڈ پر جو پہلی ہنسی ہے وہ وہزیرا سال قبل مسیح کی ہے جو حضرت سارہ کے چہرے پر آئی۔ جب ان کے خاندان حضرت ابراہیمؑ کو خدا نے بڑھا پے میں باپ بننے کی بشارت دی تھی۔ ماہر لسانیات کہتے ہیں حضرت یعقوب کے والد اٹخن جید پیدا ہوئے تو وہ ہنس رہے تھے۔ اس لیے ان کے نام کا مطلب ”قبچہ“ ہے۔ دنیا کا پہلا لطیفہ کہ پیدا ہوا۔ ہم دو قوس کے کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہماری سکھوں کے بارے میں معلومات بڑی واجبی ہیں۔ ایک فوٹو گرافر نے کئی قوسوں کے لوگوں کی تصویریں بنانے کے بعد کہا تھا میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں اتنے لطیفے انسان نے نہیں بنائے جتنے خدا نے بنائے ہیں۔ ہم ظریف الاعتقاد نہیں اس کے باوجود سمجھتے ہیں لطیفے، ٹیکسی ڈرائیور اور خاندان ہر ملک میں ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ وہ لطیفے جو ہنسنے کہتے ہیں انہیں ”چپ“ لطیفے کہتے ہیں۔ امجد اسلام امجد کو ملنے کے بعد بندہ سمجھنے لگتا ہے: دنیا کی سب سے پرانی چیز جو آج تک نہیں بدلی، وہ لطیفے ہیں۔ ہمارے ہاں مزاح نگار اسے کہتے ہیں جو پرانے لطیفے تخلیق کرتا ہے۔ دنیا کا سب سے پاپولر لطیفہ کون سا ہے؟ یہ جاننا ایسے ہی ہے جیسے لندن میگزین نے یہ جاننے کے لیے کہ عورتوں کی محبوب پینٹنگ کون سی ہے ایک مقابلے کا اہتمام کیا۔ جس میں باری باری پوچھا گیا کہ اگر Tate Gallery کو آگ لگ جائے تو آپ کو صرف ایک پینٹنگ بچانے کی

اجازت ہو تو آپ کو کئی بچائیں گی؟ تو جس خاتون کو پہلا انعام ملا، اس کا جواب تھا۔ ”جو دروازے سے قریب ترین ہوگی۔“ لیکن اگر دنیا کے سب سے محبوب لطیفہ نگار کا نام پوچھا جائے تو وہ نصر الدین ہی ہوگا۔ کسی ملک میں وہ آغا کہلاتا ہے، کہیں ملا اور کہیں خواجہ نصر الدین۔ ازبکستان کے قومی ہیرو و امیر تیمور کا سوانح نگار جنرل سب اس کی خوبیاں بتاتے ہوئے لکھتا ہے۔ امیر تیمور ساری زندگی کبھی کسی لطیفے پر نہیں ہنسا۔ اس کے سامنے کوئی لطیفہ پر ہنسا تو وہ یوں غصے میں آجاتا جیسے دوسرا اس پر ہنسا ہو۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ لطیفے پر ہنسنے کے لیے دانت ہی نہیں، دونوں ناخنیں بھی ٹھیک ہونی چاہئیں۔ لیکن آج بھی اس کے ملک کے لوگ امیر تیمور سے زیادہ نصر الدین آفندی کی باتیں کرتے ہیں۔ ملاضر الدین میں اتنی ہی حماقت پائی جاتی ہے، جتنی ہم میں دافنل۔ اس نے دنیا کا ہر پیشہ اختیار کیا، سوائے دنیا کے سب سے پہلے پیشے کے۔ ملا میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو کسی ملا میں نہیں ہوتا چاہئیں۔ کلیم ظرافت کا یہ مستقل عمران وزیر اعظم 1208ء میں ایلکھ میں پیدا ہوا۔ ترکی کا باشندہ ہونے کی وجہ سے وہ ہر بات کا جواب ترکی بہ ترکی دیتا۔ بلا پیدائش ملا تھا۔ مذہبی تعلیم کے لیے کوئٹہ کے مشہور مدرسے میں داخل کر دیے گئے۔ بچپن ہی سے طبیعت مزاح کی جانب راغب تھی۔ مدرسے سے فارغ التحصیل ہو کر مدرس بنے، پھر قاضی بن گئے۔ کچھ عرصہ شہانہ اناطولیا کے دربار سے وابستہ رہے لیکن اپنی ظرافت سے اپنی زندگی ناقابل برداشت حد تک تلخ بنائی۔ سوانا طولیا کے دربار کو چھوڑ کر کوئٹہ کے سلطنتی سلطان کے پاس چلے گئے اور ایک عالم فاضل کے طور پر پہچانے جانے لگے۔ ہم بھی انہیں عقل و دانش کا مجسمہ مانتے ہیں۔ ہمیں ان کا گدھا بھی اتنا گدھا نہیں لگتا جتنے گدھے عام گدھے ہوتے ہیں۔ ملا کی بیوی دیکھنے میں ایسی تھی کہ شام کتب سے آکر ملا نے بیوی کے چہرے کو انہماک سے دیکھنا شروع کر دیا۔ بیوی نے وچ پوچھی تو مابولے: ”آج میں نے نیک بہت خوبصورت عورت کو دیکھا۔ میں نے لاکھ کو شش کی کہ اپنی آنکھوں کو ادھر سے ہٹاؤں مگر کامیابی نہ ہوئی۔ لہذا کم از کم سو دفعہ تمہارے چہرے کو دیکھوں گا تاکہ اس کا لکھار ادا کر سکوں۔“

ادریس شاہ کی طرح ملا کے زمانے کے لوگ بھی ملا کو صوفی سمجھ لیا کرتے تھے۔ ملا ایک بار ایک گاؤں سے گزر رہے تھے۔ حسب عادت بھوکے تھے۔ گاؤں کے لوگ ایک جگہ بیٹھے



ماہر امراض طوطا چشم

ماہر امراض چشم بھی عجیب آدمی ہوتا ہے کہ لوگ اسے آنکھیں بھی دکھائیں تو خوش ہوتا ہے۔ ہمارا ایک دوست دل کا ڈاکٹر بننے کی بجائے آنکھوں کا ڈاکٹر اس لیے بنا کہ دل تو ایل ہوتا ہے اور آنکھیں دو۔ سو دو گئے مریض آئیں گے۔ آنکھیں اپنی باتوں کا اور کان سروں کی باتوں کا یقین کرتے ہیں۔ آنکھیں اتنی بڑی نعمت ہیں کہ کہتے ہیں بہشتی اور اللہ عباد و فی۔ آج کل سوشلائزیشن کا دور ہے۔ سو ممکن ہے چند سال بعد دائیں اور بائیں آنکھ

تھے۔ ملانے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا: ”جلدی سے میرے لیے کھانے کا بندو بست کرو۔ ورنہ آپ کے ساتھ بھی وہی سلوک کروں گا جو دوسرے گاؤں والوں کے ساتھ کیا ہے۔“ ملا کا اعلان سن کر لوگ ڈر کے مارے اسے صوفی سمجھ کر کھانے پینے کی اشیاء کا انتظام کرنے لگے۔ جب ملا پیٹ بھر کر طرح طرح کے کھانے کھا چکے تو گاؤں والوں نے پوچھا: ”یا حضرت! آپ نے دوسرے گاؤں والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟“ ملانے جواب دیا: ”میں ان کے گاؤں گیا۔ کھانا پانگا۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ میں ان کا گاؤں چھوڑ کر کسی دوسرے گاؤں چلا جاتا۔“ ایک بار اس کے علاقے کے لوگوں نے کہا کہ دعا کریں اللہ ہم گناہ گاروں پر رحمت باراں بھیجے۔ ملا راضی ہو گئے اور دعا استسقاء کے لیے مقررہ میدان میں گئے۔ سیکڑوں آدمی جمع تھے۔ ملانے ان کا جائزہ لیا اور بولے: ”لوگو یقین کے ساتھ امید یہ دونوں اصل ایمان ہیں۔ آپ لوگ بارش کی دعا کروانے آئے ہیں اور آپ میں سے ایک بھی ساتھ چھتری نہیں لے کر آیا۔ اگر کا مطلب ہے آپ کو دعا کے قبولی ہونے کی توقع ہی نہیں۔ اس لیے میں ایسے لوگوں کے ساتھ شامل ہونے کے لیے تیار نہیں۔“ مہر حال اس سے یہ پتہ چلے نہ چلے کہ ملا نصر الدین صوفی تھے یا نہیں، یہ ضرور پتا چلتا ہے وہ سیاست دان ضرور تھے۔ اور بس شاہ کی کتاب پڑھ کر آپ ملا نصر الدین کو صوفی یا نہیں یا نہیں۔ یہ یامیں گے کہ مصنف میں سلس آف ہیو مر ہے۔

وہ اپنی آزادی کے لیے کوئی کمر و ماتر نہیں کرتا۔ کہتے ہیں انسان آزاد پیدا ہوتا ہے حالانکہ ہم نے جتنے بھی انسان پیدا ہوئے دیکھے کوئی بھی فری نہ تھا۔ سب Cord کے ذریعے ماں سے بندھے ہوئے تھے۔ البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمام انسان فری پیدا ہوئے ہیں۔ موائے ان کے جو پرائیوٹ میٹرنی ہسپتالوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ جب کہ طوطا آزاد پیدا ہی نہیں ہوتا آزاد رہتا بھی ہے۔ جیسے نیو آکسفورڈ ڈشٹری میں کچھ ایسی ترکیبیں ہیں جن کے وہ معنی نہیں لیے جاتے ہیں۔ جیسے تاریخ کے لیے History کا لفظ ہے۔ حالانکہ تاریخ میں خواتین کا حصہ کم تو نہیں۔ سوائے Herstory کیوں نہیں کہا جاتا۔ ایسے ہی اردو ڈشٹری میں طوطا چشم ہے جو مراد لیا جاتا ہے۔ اس سے مراد یوری نہیں ہوتی۔

مگھنگو کے معاملے میں میڈم نور جہاں عورتوں کی شیخ رشید ہیں۔ ہمارا منہ بتتا سرخ ان کی باتوں سے ہو جاتا ہے۔ اتنا پھٹے نہیں ہوتا۔ نئی گلوکاروں کے آنے سے میڈم آج کل صرف باتیں ہی کر رہی ہیں۔ یونانیوں اور رومیوں کے دور میں عزت ماپنے کا پیمانہ یہ تھا کہ کس کو کتنی فرمت ہے؟ سو آج کل موسیقار میڈم کو زیادہ سے زیادہ عزت دیتے ہیں لگے ہوئے ہیں۔ میڈم ذرا سی بات محسوس کر لیتی ہیں۔ کہتے ہیں ایک دفعہ جوانی میں نپٹے گئیں۔ ”کل میری بڑی بے عزتی ہوئی۔“ پوچھا: ”کیا ہوا؟“ بولیں: ”میں نے فلاں اداکار سے کہا مجھے میرے گھر تک چھوڑ آؤ۔ تو دیدہ بھا مجھے میرے گھر تک چھوڑ آیا۔“ اب موسیقاروں نے نئی لڑکیوں کو گوانا شروع کیا ہے تو میڈم محسوس کر گئی ہیں۔ اس عمر میں بندہ کبھی محسوس کر سکتا ہے۔ جب صبح کی شریات کو مستنصر حسین تارڑ سے فارغ کیا گیا تو اسلام آباد جیسی ڈرائیور یونین کے عہدے داران کے پاس آئے اور کہنے لگے ہم ٹیکسیاں ڈیو لے جائیں گے اور اس حد تک جائیں گے کہ ٹی وی والے آپ کو دوبارہ بلائے پر مجبور ہو جائیں گے۔ وہ تو تارڑ صاحب نہ مانے درندہ دین ٹیکسیاں ہی ٹی وی والوں کا فیصلہ بدلنے کے لیے کافی تھیں، لیکن میڈم پر ہونے والی زیادتی پر ٹیکسی ڈرائیور یونین نے بھی احتجاج نہیں کیا۔ حالانکہ جیسی ڈرائیور ٹی گلوکاروں کے گانے سن لیتے تو انہیں یقین ہو جاتا کہ سائیکلیئر کتنی بڑی ایجاد ہے۔ اس کے باوجود میڈم پہلے دن ل طرح آج بھی اتنی ہی پسند کی جاتی ہیں جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ نصاب میں

کے الگ الگ ماہر ہوں، لیکن ہمیں ڈگر ڈاکڑوں سے ہمیشہ سے شکایت تھی کہ ان کے ہاں سیدشلت نہیں ہوتے۔ بالخصوص امراض ماہر طوطا چشم تو ایک بھی نہیں ہے لیکن محترمہ نور جہاں صاحبہ کا یہ بیان پڑھ کر کہ موسیقار طوطا چشم ہیں ہماری یہ شکایت جاتی رہی۔ ہمیں موسیقی سے تب سے لگاؤ ہے جس دن سے ہم نے میڈم نور جہاں کو دیکھا ہے یعنی مدتیں ہو گئیں۔ ہمیں علم نجوم کا شوق ہوا تو ستاروں کی چال دیکھنے فلم شوڈیو ز جانے لگے۔ انہی دنوں ایک گلوکار نے ایک موسیقار سے کہا: ”مجھے نور جہاں کے مقام تک پہنچا دیں۔“ تو موسیقار بولا: ”میں تو نہیں پہنچا سکتا۔ البتہ چونتیس گھنٹوں اور کچھ دیر کے لیے ہم میڈم کی گلوکاری کے ہی فین تھے۔ پتہ نہیں تھا کہ وہ امراض طوطا چشم کی ماہر بھی ہیں۔ ان کے بیان کے بعد سے وہ موسیقار جو آنکھوں سے صرف چشم پوشی کا کام لیتے تھے، ملے والوں کو بھی آنکھیں دکھانے لگے ہیں۔ ہم نے میڈم کی آنکھیں نہ دیکھیں۔ کہتے ہیں وہ صرف اپنوں کو آنکھیں دیکھاتی ہیں۔ میڈم آنکھیں دکھا سکتی ہیں۔ وہ اداکارہ ریشم کی طرح تو نہیں جسے خود اپنی آنکھیں دیکھنے کے لیے ڈھونڈنا پڑتی ہیں۔ ہمیں جیرائی یہ ہوتی ہے کہ موسیقاروں کو طوطا چشم کہنے پر رشید عطرے، ایم اشرف، ڈو الفقار علی اور دوسرے کئی موسیقار جن کا طوطی بول رہا ہے، بولنے لگے ہیں۔ ویسے ہمیں آج تک یہ سمجھ نہیں آئی کہ آخر طوطے کی آنکھوں میں کیا خرابی ہے کہ انسان کو طوطا چشم کہا جاتا ہے۔ اس پر طوطی یہ کہ طوطے کی بجائے اس پر برا بھی انسان ہی مانتا ہے۔ ہماری اردو شاعری میں محبوب کی تعریف کرنے کے لیے اس کی آنکھوں کو ہمیشہ جانور سے تشبیہ دی جاتی ہے جیسے ہرنی جیسی، چھل جیسی یا بلی جیسی آنکھیں آخر ہم طوطا پسند شخص ہیں۔ ہمیں طوطے میں اس کے علاوہ کوئی خرابی نظر نہیں آتی کہ وہ انسانوں کی طرح باتیں کرنا سیکھ جاتا ہے۔ کہتے ہیں طوطے کی آنکھوں کو برا اس لیے کہتے ہیں کہ دوسرے پرندوں مثلاً کبوتر وغیرہ کو سدھا اور اسے بچرے سے نکال بھی دو تو خود ہی بچرے میں واپس آ جاتے گا، جبکہ طوطے کو جتنی مرضی چوری کھلاؤ۔ برسوں بعد بھی آپ کی غلطی سے بچرے کا دروازہ کھلا رہ گیا تو وہ پھر سے اڑ جائے گا کیونکہ طوطا کسی سے مخلص نہیں ہوتا سوائے طوطیوں کے۔ ہمیں اس کی یہی خوبی سب سے اچھی لگتی ہے۔ کبوتر امن نگدھا محسوس، شاہین بہادری اور کوئل خوش الحانی کی علامت ہے تو طوطا آزادی کی علامت ہے۔



بیگم ڈول اور بیگم ڈانوال ڈول

ہم نے ایک امریکی صحافی سے ان کے سابقہ حکمرانوں کی تصاویر مانگیں تو اس نے ہمیں جو تصویریں بھجوائیں وہ خواتین کی تھیں۔ ہم نے کہا: ”جہاں تک ہمیں علم ہے۔ امریکہ میں آج تک کوئی خاتون صدر نہیں بنی۔“ بولے: ”وائٹ ہاؤس کی اصل حکمران تو صدور کی بیویاں ہوتی ہیں۔“ شاید اسی لیے اس بار امریکی گلدھے اور ہاتھی کی بجائے بل کلنشن اور باب ڈول کی بیویوں میں مقابلہ کر رہے ہیں۔ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ جس طرح صدارت کے امیدواروں کا آپس میں

پڑھائی نہیں جاتیں۔ وہ ہمارے موسیقی کی جان ہیں اور آج کل موسیقی کی جان بنی ہوئی ہے۔ ریٹائرڈ چیف جسٹس ڈاکٹر نسیم حسن شاہ صاحب کے والد محسن شاہ کا قد ان سے چند انچ ہی بڑا تھا۔ وہ نسیم حسن کے قد کے بارے میں بڑے فکر مند رہتے۔ ایک دن وہ انہیں حکیم قرشی کے پاس لے گئے۔ حکیم صاحب نے نسیم حسن کو ایک کونے سے دوسرے کونے کی طرف چلنے کو کہا۔ نسیم حسن شاہ بتاتے ہیں: میں نے چل کر دکھایا تو حکیم قرشی میرے والد کو کہنے لگے: ”تمہارے بیٹے کا قد نہیں بڑھ سکتا کیونکہ یہ حلال زادہ ہے۔“ سو ہمارے موسیقاروں کا قد بھی نہیں بڑھ سکتا کیونکہ یہ اور بیگنل ہیں۔ تاہم انہیں خوش ہونا چاہیے کہ میڈم نے انہیں بے وفا سمجھ کر طوطا چشم کہا۔ اگر وہ انہیں وفادار سمجھ کر تشبیہ دینا چاہتیں تو بڑا مسئلہ پیدا ہو جاتا۔ آپ کو پتہ ہی ہے وفا کی علامت کون سا جانور ہے۔

ناٹون نے بل سے پوچھا: ”پچاس سالوں میں آپ کی سب سے بڑی کامیابی کون سی رہی؟“ تو ہنسنے کہا: ”1975ء میں ہٹلری کو اپنے ساتھ شادی کے لیے رضامند کرنا۔“ کلنٹن کی زندگی پر ہٹلری نے جو نقوش چھوڑے ان میں ایک نشان کلنٹن کی ناک پر تھا جس کی پلاسٹک سرجری لڑائی گئی کیونکہ آج کل حسن دیکھنے والے کی آنکھ میں نہیں پلاسٹک سرجن کے نشتر میں ہوتا ہے۔ کلنٹن پر کئی مقدمے ہیں۔ اب وہ 1.7 ملین ڈالر کا مقروض ہے۔ اگرچہ عورت کا خاندان مرد اور مرد کا خاندان قرضہ ہوتا ہے اس سلسلے میں ایک عدالت میں ایک وکیل نے شادی شدہ ہے۔ ”یا پہلے آپ پر جرح ہوئی؟“ تو دوسرا وکیل بولا: ”ہاں یہ شادی شدہ ہے۔“

ایک اوسط امریکی بیوی اس سے آدھا سستی ہے جتنا اس کا خاندان ہوتا ہے وہاں جو جوڑے خوش رہ رہے ہوتے ہیں وہ ہر ہفتے تقریباً 57 منٹ آپس میں بات کرتے ہیں اور جن کی طلاق ہونے والی ہوتی ہے وہ ہفتے میں 117 منٹ باتیں کرنے لگتے ہیں۔ ایک امریکی ایوب لکھتا ہے: ”میں اور میری بیوی نے پندرہ سال بڑی ہنسی خوشی گزاری ہے پھر ہم نے شادی کر لی۔“ امریکہ میں صرف 38 فیصد گھروں میں بیویاں ہیں۔ ایک امریکی بیوی کو اوسطاً سال میں 47 مرد سرد ہوتے ہیں اور وہ 1500 مرتبہ آمیزہ دیکھتی ہے۔ امریکی شادی شدوں کو ہی اپنا صدر شاید اس لیے پھٹتے ہیں کہ ان میں قوت برداشت زیادہ ہوتی ہے یہی جاننے کے لیے کہ ان کے آئندہ صدر میں کتنی قوت برداشت ہوگی وہ ان کی بیویوں کا مباحثہ چاہتے ہیں۔ امریکی شکل پر اترتا جاتے ہیں کہ 1959ء کے مشہور ٹی وی مباحثے میں نکسن اور کینیڈی کو چن لیا جہاں تک بیگم ڈول اور بیگم ہنسن کا تعلق ہے۔ بیگم ڈول پاس نہ ہو تو ہٹلری اچھی لگتی ہے۔ وہ پاس ہو تو ہٹلری بہت اچھی لگتی ہے۔ باب ڈول اتنا اچھا بیڑے کہ وہ تو بحث میں اپنی بیوی سے بھی جیت جاتا ہے۔ ہٹلری کو یہ فائدہ ہے کہ امریکی اس کے بارے میں بہت زیادہ جانتے ہیں۔ جب کہ بیگم ڈول کو یہ فائدہ ہے کہ امریکی اس کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ دونوں بیگم کا آئی کیو ٹیسٹ ہونا چاہیے۔ یاد رہے آئی کیو وہ چیز ہے جو مرد عورت میں دیکھنا چاہتا ہے اس وقت جب وہ اور سب دیکھ چکا ہوتا ہے۔ 57 فیصد امریکی سمجھتے ہیں ہٹلری بل کلنٹن کی بہترین سرمایہ کاری اور بدترین ذمہ داری ہے جب کہ بیگم ڈول کا معاملہ ڈولوں سے جہاں تک مباحثے کا تعلق ہے اس کا موضوع شاہجگ ہونا چاہیے کیونکہ شاہجگ کرتے ہوئے خواتین اول کی اول درجے کی صلاحیتیں سامنے

مباحثہ ہوتا ہے ایسے ہی ان کی بیویوں کا بھی ہونا چاہیے تاکہ بیوی کچھ کر صدر بنا جائے۔ ہم نے ایک مبصر سے پوچھا: ”امریکی سیاست میں آنے کے لیے سب سے پہلے کیا ضروری ہے؟“ بولے: ”بیوی۔ کیونکہ آج تک صرف ایک امریکی صدر کنوارہ ہوا ہے۔“ تب تو شاید امریکی شادی کرتے ہی اسی امید پر ہیں۔ صدر کی بیویوں میں سب سے بڑی خوبی یہی ہوتی ہے کہ ان کے خاندان صدر ہوتے ہیں۔ نیشنل پرنسپل سے کسی نے پوچھا: ”آپ کی بیوی نے کس موقع پر آپ سے زیادہ عقل مند کی کا مظاہرہ کیا؟“ تو وہ بولے: ”اس وقت جب اسے اپنے لیے خاندان کا انتخاب کرنا تھا۔“ سیانے تو تب دیکھ کر مرض اور بیوی دیکھ کر خاندان کی حالت بتا دیتے ہیں۔ آج کل امریکی صدر دنیا کا سب سے طاقتور آدمی ہے اس کا سب پر حکم چلتا ہے اور اس پر اگر کوئی حکم چلا سکتا ہے تو وہ اس کی بیوی ہی ہے۔ اس لیے صدر جانسن نے اپنی بیوی لڈی برڈ سے ڈر کر اوول آفس میں بذر سسٹم لگوا لیا تھا تاکہ جو بیوی آئے تو صدر کو بردت خبردار کیا جاسکے۔ امریکیوں کو اپنے صدر سے زیادہ ان کی بیویوں پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے کیونکہ صدر پر کوئی چپک نہیں ہوتا سوائے بیویوں کے جو بیوی سے نہیں ڈرتا وہ کنوارہ ہی ہو سکتا ہے۔ انگلینڈ کے ڈیوک آف ہارلورگ نے بیوی کو ایک جگہ کے دوران لکھا تھا: ”میرے سامنے اس لمبے دنیا کے ساتھ ہزار بہترین فوجی ہیں جن کی کمان یورپ کے بہترین جرنیل کر رہے ہیں، لیکن مجھے ان سے اس سے آدھا خوف بھی نہیں جتنا تمہیں غصے میں دیکھ کر ہوتا ہے۔“ ہارٹھاواڈ شفتن تو امریکہ کے صدر کو ”مائی اولڈ مین“ کہہ کر بلاتی۔ اینڈرو جانسن نے اپنی زندگی روزی کی حیثیت سے شروع کی۔ اس کی بیوی نے اسے پڑھا لکھا کہ امریکہ کا صدر بنایا۔ بولی: ”جب جانسن صدر بن گیا تو میں وائٹ ہاؤس میں بیوی کے عہدے پر فائز ہو گئی۔“ صدر لسن کی بیوی اینڈریل بیوی ثابت ہوئی۔ شروع ہی سے اسے جانور پالنے کا شوق تھا۔ جب ولسن جنگ عظیم اول میں مصروف تھا تو اس کی بیوی نے وائٹ ہاؤس میں بیٹھیں پال رکھی تھیں تاکہ موزے بننے کے لیے ”ستارہ اداون“ دستیاب ہو۔ ٹرومین جب کوئی غلط بات کر تا اس کی بیوی اسے ٹوک دیتی۔ اس لیے وہ غلط بات کرنے سے پہلے بیوی کو لاکھ لاکھ بھیج دیتا۔ باربرا خاندان سے ناراض ہوتی تو اسے اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر کھاتی۔ جب صدر بش نے اس سے پوچھا کہ میں نے خلیج کی جنگ کا فیصلہ ٹھیک کیا ہے یا غلط؟ تو وہ بولی: ”میرے لیے ایک کپ کافی بنا کر لاؤ۔“ پچھلے دنوں بل کلنٹن کی پچاسویں سالگرہ پر ایک



بیوٹی سنڈروم

اس صدی کے شروع میں جب ایک سیانے نے کہا کہ بیوٹی کی تلاش میں نکلو تو آنکھ کی بجائے کان کا استعمال کرو کیونکہ آپ نے بیوٹی کو اتنا دیکھا نہیں، جتنا سننا ہوتا ہے تو کسی نے اس دانشور کی بات پر کان نہ دھرے۔ اب ڈاکٹر ایڈگر نے کہا ہے کہ خوبصورت بیوٹی صحت کے لیے معرے تو سب کے کان کھڑے ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹروں کی باتیں سن کر ہم بھی خود کو ڈارون مارکس، ٹالسٹائی اور فرانزکے سمجھنے لگے ہیں۔ یعنی ہمیں بھی مستقل مرد در رہنے

آتی ہیں۔ ہمارے ہاں تو مرد اول کی صلاحیتیں بھی تب ہی سامنے آتی ہیں۔ اگرچہ مردوں کی شاپنگ پر یہ تبصرہ ہی کافی ہے کہ ہر بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹور پر مردوں کی ضروریات کی چیزیں ہمیشہ گراؤنڈ فلور اور گیٹ کے پاس رکھی جاتی ہیں۔ کچھ امریکی عورتوں کے مباحثے کے حق میں نہیں کہ اس میں وہ بہت بولیں گی، حالانکہ امریکی ماہر فلکیات مائیکل کولنز کہتا ہے: ”ایک مردوں بھر میں اوسط بچپس ہزار الفاظ بولتا ہے جب کہ ایک عورت کی دن بھر کی گفتگو تیس ہزار الفاظ پر مشتمل ہوتی ہے۔“ مسئلہ صرف یہ ہے کہ مرد جب دن کے اختتام پر گھر پہنچتا ہے تو وہ اپنے بچپس ہزار الفاظ بول چکا ہوتا ہے جب کہ بیوی تیس ہزار الفاظ کا آغاز کر رہی ہوتی ہے۔ ”ان دونوں بیگمات میں وہی فرق ہے جو ان کے خاوندوں میں ہے۔ امریکی جریدے تو کنٹینن اور ڈول کے ڈولے، قد، وزن اور کمر کے ماپ کے یوں تقابلی جائزے شائع کر رہی ہیں جیسے انہیں فلم کے لیے ہیرو کی تلاش ہو۔ اب دیکھتے ہیں دونوں بیگمات میں سے کسے مات ہوتی ہے اور کسے امریکی گڈ گرل قرار دیتے ہیں۔ ویسے امریکیوں کا کچھ پتہ نہیں۔ ایک لڑکی نے کہا:

”میں ایک گڈ گرل ہوں۔“

امریکی بولا: ”پھر تم واقعی گڈ گرل ہو۔“

یونی: ”کسی نے بھی نہیں۔“

ہی۔ ”آپ نے اسی لیے پیاسے شادی کی تھی۔“ ہم جہن بیویوں کے خاوند خوبصورت نہیں ہوتے، وہ بھی سمجھ رہی ہیں۔ ویسے تو ہمیں یہ حسن عین تحقیق بد صورتوں کی پہلنی کھین لگتی ہے۔ اب تو کسی کوراز کی عمر کی دعا دینا بھی دراصل یہ دعا دینا ہے کہ اللہ اسے بد صورت ہی دے۔ اگر چہ ڈاکٹر وہ بندہ ہو جائے بیوی کو بھی اس دن غور سے دیکھتا ہے جس روز وہ بہار ہو۔ وہ تو خوبصورت عورت کو بھی دیکھنے کی فیس لیتا ہے، لیکن دنیا کے پہلے ہارٹ مر جن ڈاکٹر کرسٹن برنارڈ نے کہا ہے شکل اتنی اہم ہوتی ہے کہ اگر کسی خوبصورت نہ ہو تو اور میری جگہ کوئی مٹھا، مٹھا، بد شکل ڈاکٹر یہ آپریشن کرتا تو اسے وہ پذیرائی نہ ملتی جو مجھے ملی۔ ڈاکٹر کرسٹن نے ایک عورت سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کسی نے وجہ پوچھی تو کرسٹن نے کہا: ”اس کا ماضی!“ سننے والے نے کہا: ”خاتون بڑی صالح ہے۔ اس کا ماضی تو بہت اچھا ہے۔“ تو ڈاکٹر کرسٹن بولے: ”اچھا تو ہے مگر بے وزاں۔“ بہر حال حسین بیویوں کے خاوند عمر میں صرف 12 سال کا اضافہ کرنے کے لیے اپنی بیویاں چھوڑنے سے تور ہے۔ یونکہ خوبصورت بیوی حاصل کرنا کون سا آسان کام ہے۔ ہم نے فی وی پر فلم ”سرگم“ دیکھی۔ عدنان سیج کئی دنوں اور ایکس سرکلز سے گزر کر اپنی زیبا بختیار تک پہنچتا ہے۔ ایڈن کلک کہتا ہے شادی شدہ آدمیوں کے لیے سب سے حیران کن بات یہ ہے کہ غیر شادی شدہ لوگ اپنے بچپنوں کا کیا کرتے ہیں؟ ایسے ہی خوبصورت بیویوں کے خاوندوں کے لیے سب سے پریشان کن بات یہ ہوتی ہے کہ لوگ ان کی بیویوں کو خوبصورت کیوں کہتے ہیں؟ ہم نے ایک دوست سے پوچھا: ”پرسوں فلاں ہو ٹل میں تمہارے ساتھ وہ حسین دوشیرہ ہون تھی؟“ بولا: ”وہ میری بیوی تھی، مگر خدا کے لیے یہ اس کے سامنے نہ کہہ دینا۔“ ہم نے تو خوبصورت عورت کی شادی پر لوگوں کو خوش اور طلاق پر کبھی رنجیدہ ہوتے نہیں دیکھا۔ مشتاق بوسنی کہتے ہیں مجھے کافی دن کا کافکا مر دکاناچ، اتوار کے ملاقاتی اور خوبصورت عورت کے خاوند سے چلے۔ ”اٹلی کی کہات ہے۔“ ”بکسی بیٹی چاہتے ہو ویسے بیوی لاؤ۔“ سو کہن بھی بیوی سے بندہ شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس کی مرضی ہے ڈاکٹر کو اس میں مداخلت نہیں کرنا چاہیے۔ ویسے سب سے اچھی شارکہ وہ ہوتی ہے جو مردہ ہو اور خوبصورت بیوی وہ ہوتی ہے جو دوسرے کی ہو۔ آپ کی گاڑی اس دن پرانی ہوتی ہے جس دن ہمسایہ نئی گاڑی

لگا ہے۔ ہم ڈاکٹر ان کے دلدادہ نہیں، کیونکہ مقدمہ بازی کے شوقین کے پاس دولت اور ڈاکٹر ان کے دلدادہ کے پاس صحت کم ہی ہوتی ہے۔ اس کے باوجود ہم ڈاکٹر کو کو ماننے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ بندہ ایک گردے سے بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ ہم نے مرنے کے بعد ایک گردہ عطیے میں دینے کا اعلان کر دیا ہے۔ ہم تو شادی کے چھ سات سال بعد کسی میاں بیوی کو ایک ساتھ داک کرتے دیکھ لیں تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ میاں کو یہ کچھ کرنے کا ڈاکٹر نے کہا ہو گا۔ امریکیوں کو تحقیق کرنے کا اس قدر شوق ہے کہ انہیں کوئی موضوع نہ ملے تو اس پر تحقیق کرنے لگتے ہیں کہ ان کا ”سنگل فادر“ کون تھے جو کچھ تحقیق محدود رکھتے ہوئے یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا ”سنگل فادر“ کون تھا؟ کز شہزادوں دنوں وہاں کی ایک بیویور سٹی نے 1935 مرے ہوئے شادی شدہ مردوں کی میڈیکل ہسٹری پر ریسرچ کرنے کے بعد یہ انکشاف کیا کہ خوبصورت بیویوں کے خاوند جلد مر جاتے ہیں۔ ڈاکٹر ایڈگر نے کہا کہ بد صورت اور قبول صورت بیویوں کے خاوندوں کی اوسط عمر خوبصورت بیویوں کے خاوندوں سے 12 سال زیادہ ہوتی ہے۔ ہم نے سوچا شاید بد صورت بیویوں کے خاوندوں کو ویسے ہی اپنی عمر 12 سال زیادہ لگتی ہو، لیکن ڈاکٹر ایڈگر نے بتایا کہ حسین بیوی کے خاوند 80 فیصد زیادہ تھوڑا کا شکار رہتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنی موتاں ہیں، پھر امریکی خاوندوں کو یہ ڈر ہوتا ہے کہ ان کی حسین بیوی کہیں انہیں چھوڑ نہ جائے۔ وہ کسی تقریب یا بازار میں بیوی کے ساتھ چلے جائیں تو سب کی نظریں ان کی بیوی پر ہی ہوتی ہیں۔ اس لیے وہ کبھی ریلیکس نہیں ہوتے۔ اگرچہ پاکستان میں اتنی پریشانی نہیں کیونکہ ہمارے ہاں عورتیں پردہ کرتی ہیں۔ برقع میں ان کی صورت کم سیرت زیادہ کھتی ہے۔ صوبہ سرحد کے بیشتر علاقوں میں تو سڑک پر عورت کا چہرہ نظر آنا ایسے ہے جیسے سڑک پر سو کاٹھ پڑا نظر آنا۔ ویسے تو ڈاکٹر ایڈگر اس کی ریسرچ سے ان کی ذاتی بیوی بھی پریشان ہے کیونکہ ڈاکٹر ایڈگر کی طویل عمری کے باعث بیوی یہ سوچنے لگی ہے کہ اس کا مطلب ہے ایڈگر مجھے حسین ہی نہیں سمجھتا۔ ہماری ایک ممتاز اداکارہ کی بیٹی نے ماں سے کہا: ”ای جب میں بڑی ہوں گی تو میرا بوائے فرینڈ بوائینڈم ہو گا۔“ ماں نے مذاق میں کہا: ”اگر تمہارا بوائے فرینڈ اپنا ہینڈم ہو تو دوسری لڑکیاں تم سے جھین لیں گی۔“ وہ کچھ لمحے چپ رہی پھر اپنے آپ کی طرف دیکھ کر

لاتا ہے۔ بیوی کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

اردو شاعروں کو پڑھ کر لگتا ہے جتنے جان لیوا اسلئے ہیں ان میں حسن سب سے کاری ہے۔ ان کا بس چلے تو بلا لائنس حسن رکھنا قابل دست اندازی پولیس قرار دے دیں۔ حسن کا آنکھوں پر اتنا اثر پڑتا ہے کہ بیوی نے خاوند سے کہا: ”دیکھا وہ سپاہی اس حسین لڑکی کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا جو ابھی ابھی گزری ہے؟“ تو خاوند بولا: ”کون سپاہی؟“ ہماری شاعری میں تو لوگ حسن پر ساری عمر قربان کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اگر خاوند 12 سال قربان کر دیتے ہیں تو یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں بیماری تو عمر ہے۔ بندے کو پیدا ہوتے ہی یہ مرض لگتی ہے اور بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ جرمن کہتے ہیں انسان تو پیدا ہوتے ہی مرے شروع کر دیتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ لوگ جوانی میں مرتے ہیں اور اکثر حسینوں پر مرتے ہیں۔ البتہ یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ ان میں حسینوں کے اپنے خاوندوں کا نام آیا۔ ورنہ شاعری میں حسینوں کے خاوند اتنے ہی اہم تھے جتنے اہم وہ اپنے گھر میں ہوتے ہیں۔ جب یہ تحقیق بل کلنٹن کو اس کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر بتائی گئی کہ خوبصورت بیوی کے خاوند کی عمر بد صورت کے خاوند سے 12 سال کم ہوتی ہے تو بھلری نے کلنٹن سے کہا: ”تھیک گاڈ! تم نے مجھ سے شادی کی ورنہ تم آج 62 سال کے ہوتے۔“



مولانا زلزلہ

ہم صرف ان کے حق میں لکھتے ہیں جن کے ہم خلاف ہوتے ہیں کیونکہ ہم تو کسی کی تعریف بھی کر دیں تو لوگ اس پر ہنسنے لگتے ہیں۔ پھر ہم سیاستدانوں کے بارے میں اتنا کم ہانتے ہیں کہ ان کے ساتھ ہمیشہ عزت سے پیش آتے ہیں۔ ایک سیاستدان نے کہا تھا کہ جب لوگ کہتے ہیں کہ وہ مجھے جانتے ہیں تو میں گھبرا جاتا ہوں، لیکن پھر جب وہ عزت سے پیش آتے ہیں تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ اس کے باوجود ہم مولانا

وزی مہمان ہے ہم اسے جلد رخصت کر دیں گے۔ سچی بات ہے یہ بیان کوئی پٹھان دے ہی نہیں سکتا۔ پٹھانوں کے ہاں تو دشمن جان بھی مہمان بن کر آجائے تو اس کے بھی محافظ بن جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں بڑے شاعر وہوتے ہیں جن کے شعروں کی ہم جیسوں کو سمجھ نہ آئے۔ ایسے ہی قاضی صاحب ہمارے بڑے لیڈر ہیں۔ نواز شریف کو انجیر اور قاضی صاحب کی بھی سمجھ نہیں آئی۔ جمیعت علماء اسلام کے حافظ حسین احمد نے جزل جہانگیر کرامت کے بارے میں کہا تھا: "ہماری فوج کے سالار وہ ہیں جو کافری بھی غصائی کر کے پیتے ہیں۔" قاضی حسین احمد تو وہ لیڈر ہیں جو پانی بھی اہال کر پیتے ہیں۔ اتنی متحرک شخصیت کہ وہ بیٹھے بھی دل تو لگتا ہے چل رہے ہیں۔ مستقل مزاج بندے ہیں۔ یاد رہے مستقل مزاجی اس سخت بات کو کہتے ہیں جو آپ اس وقت کرتے ہیں جب سخت سخت کر کے تھک جاتے ہیں۔ قاضی صاحب جس دن کو سمجھ نہ کریں اس دن انہیں تھکاوٹ ہو جاتی ہے۔ (The State of Pakistan Economy کوئی توجہ کے اندر کتاب الٹی تھی۔ ہم نے بک شاپ اسے لے لیا کہ یہ ہاتھ پڑنے لگتی کر دی ہے تو وہ بولا نہیں 'موجودہ حکومت نے کی ہے۔

میں تو اخباروں میں بابا کلثی، نصیر اللہ بار، شیخ رشید، خالد کھل اور دوسرے اعلیٰ و نیویں کے بیان پڑھ کر لگتا ہے کہ پنجابی فلوں کے ڈائناگ پڑھ رہے ہیں، لیکن پھر رضی کا بیان پڑھ کر وہی محسوس ہوتا ہے جو فلوں میں مایوں قریشی، 'لوہ' نصیر اللہ، بٹ، زبیر، اور مصطفیٰ قریشی کے بعد سلطان راہی کی بڑھک تن کر محسوس ہوتا ہے۔ قاضی حسین احمد جوانوں میں بہت پاپولر ہیں۔ جس عمر کے جماعت کے امیر ہو گزرے ہیں اس باب سے تو قاضی صاحب خود بھی ابھی توجوان ہی ہیں۔ آئندہ پروف کی وفات سے قبل 1981ء میں سوویت یونین کے پورٹ بیورو کے گیارہ اراکین میں سے چھ ستر برس سے انڈیا لڑ گئے تھے۔ صرف گور باجوف ساٹھ برس کے تھے جنہیں سب پچھ سمجھ کر بولنے نہ آتے۔ شاید اسی لیے جماعت اسلامی کا امیر بننے کے بعد لوگوں نے قاضی صاحب کو جماعت کا ہاتھ کتنا شروع کر دیا۔ گور باجوف تو اب غراباجوف ہو گیا جب کہ قاضی صاحب تو انہیں کور گور باجوف بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ ایوان اقتدار اور ایوان انتظار دونوں اس لیے لڑ رہی ہیں۔ اور کچھ پتہ نہیں چل رہا اس لڑنے کا مکر کہاں ہے؟

ڈیزل اور مولانا زلزلہ پسند ہیں۔ مولانا فضل الرحمن اس لیے کہ ان پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔ وہ بچپن ہی سے بزرگ چلے آ رہے ہیں۔ جب بھی ڈیزل ہنگا ہوتا ہے ہماری نظر میں ان کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ قاضی حسین احمد اس لیے پسند ہیں کہ وہ جو کہتے ہیں 'کر کے دکھاتے ہیں۔ جیسے بیٹے کے روز قاضی حسین احمد نے ڈسٹرکٹ باروم ہانسہ میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ عوام کی متحدہ قوت سے ہم حکمرانوں کے ایوان میں زلزلہ لے آئیں گے۔ اسی وقت یعنی ایک ریخ کراچ منٹ پر زلزلے کے جھٹکے محسوس ہونے لگے۔ ٹھیک پیر نے کہا تھا میں کیا رکھا ہے۔ تب شاید نام میں کچھ نہ ہوتا ہو اب تو سب کچھ ہے۔ بے نظیر بھوکا نام بے نظیر زرداری ہی ہوتا ہے تو اس کے آدھے دوٹ کم ہو جاتے ہیں۔ شاید اسی لیے تہجد دولت نے نواز کھوکھر کو کہا ہے کہ دونوں استعفیٰ دے کر ایک ہی حلقے سے الگیشن لڑیں۔ اگر میں ہار گئی تو اپنا نام بدل کر نواز کھوکھر رکھ لوں گی۔ ایسی ہی شیخ رشید نے کہا ہے "حکومت اسی سال اپنے گھر چلی جائے گی۔ اگر نہ گئی تو امیر انام بدل کر آصف زرداری رکھ دینا۔" اس سے تو لگتا ہے کہ شیخ رشید کو شش کرے گا کہ حکومت اس سال اپنے گھر نہ ہی جائے۔ نواز شریف نے کہا ہے کہ بینظیر حکومت نے جو خزانہ لوٹا ہے اس کی پائی پائی قوی خزانہ میں دوبارہ جمع نہ کرواؤں تو امیر انام بدل دینا۔ اگرچہ انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ پھر انہیں کس نام سے بلایا جائے۔ اس صورت میں تو انہیں بے نظیر ہی کہا جانا چاہیے۔ قاضی حسین احمد کے لیے تو اب بھی دونوں بے نظیر ہی ہیں۔ جماعت اسلامی کے رکن قومی اسمبلی صاحبزادہ فتح اللہ خان تو فرما چکے ہیں کہ جماعت اسلامی نے فاطمہ جناح کے بڑھاپے کے باعث اس کی حمایت کی تھی۔ بے نظیر بھوکا مخالفت اس لیے کر رہے ہیں کہ یہ جوان ہے۔ ہمیں تو یہ بیان بے نظیر بھوکا تعریف لگتا ہے۔ امریکہ کے ایک محقق نے گایوں پر کام کیا۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ عورت کے لیے سب سے بڑی گالی کیا ہے؟ تحقیق کے بعد اس نے کہا: "عورت کے لیے سب سے ناپسندیدہ گالی اسے یہ کہنا ہے کہ وہ بڑھی ہوئی ہے۔" بہر حال ہم سیاستدانوں کے ناموں کی بات کر رہے تھے۔ ان کے پاس نام کے علاوہ وہ تانی کیا ہے؟ کام بھی تو ان کے برائے نام ہی ہوتے ہیں، لیکن گزشتہ دنوں مولانا زلزلہ قاضی حسین احمد صاحب کا اخبار میں بیان پڑھ کر لگا کہ کسی اور نے بھی اپنا نام قاضی حسین احمد رکھ لیا ہے۔ بیان تھا کہ حکومت چند

بہر حال ہمیں سمجھ نہیں آ رہی کہ وہ شخص جس نے زندگی شاعری کے لیے وقف کر دی اور شاعری زندگی کے لیے اے اب پتول کی کیا ضرورت آپری۔ کسی شاعر کو سب سے زیادہ خطرہ اپنے پیٹ سے ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا ہے ”مجھے بہت عرصہ پہلے ہی پتول لے لینا چاہیے تھا۔“ جس سے لگتا ہے اتنے برس وہ پتول کا کام اپنی زبان سے ہی لیتے رہے۔ شاعری کا تو دیے بھی ہمارے معاشرے میں اس قدر احترام ہے کہ جب کبھی ایک شاعر کی جیب نہیں کاٹتے۔ چند برس پہلے کی بات ہے ڈاکوؤں نے فلائنگ کوچ روکی اور ہر کسی کو لوٹنے لگے۔ ہمارے ایک مشہور شاعر اس میں سوار تھے۔ ڈاکوؤں کو انہوں نے بتایا کہ میں فلاں شاعر ہوں تو ڈاکوؤں نے انہیں لوٹنے سے معذرت کر لی۔ بعد میں شاعر موصوف کے مدافین کہتے رہے کہ ڈاکو ایک شاعر موصوف کے مدافین ہیں جب کہ ناراضکن کہتے رہے کہ ڈاکوؤں نے اس لیے نہ لوٹا کہ یہ شاعر ہیں ان کی تلاشی پر وقت کیوں ضائع کریں۔ کراچی کے حالات ایسے ہیں کہ پہلے اس کے ساحل پر بچے ریت سے گھر وندے بناتے تھے اب قبریں بناتے ہیں۔ سو جب احترام الامان کراچی آئے اور ڈاکوؤں نے ان کی بیاض چھیننے کی کوشش کی تو ہم نے یہیں سمجھا چونکہ کراچی میں زیادہ تر اسلم حکومت نے قبضے میں لے لیا ہے سو ڈاکو اس لیے بیاض چھیننا چاہتے ہوں گے تاکہ آئندہ احترام الامان کا کلام سنا کر لوگوں کو لوٹ سکیں، لیکن جب لاہور میں رومی کجھای کی چار غریبوں دن دیہارے بھجھیاں گئیں تو ہمیں پریشانی ہو گئی۔ ہمیں رومی کجھای بھی بہت پسند ہیں۔ ان لوگوں کو بچا ستنے ہی نہیں اونچا سمجھتے بھی ہیں۔ رومی کجھای صاحب نے تو جب سے مہرنگ ایڈ گولیہے سب سے انہیں سننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کیونکہ انہیں دیکھ کر ہی اب لوگ چلا کر بولنے لگتے ہیں۔ سنا ہے آج کل وہ اپنی غریبیں بینک میں جمع کروانے کا سوچ رہے ہیں۔ اگرچہ انی شاعر رومی کجھای صاحب سے حسد کرنے لگے ہیں کہ آخر ہماری غریلوں میں کیا کمی ہے؟ اس بار جب پنجاب یونیورسٹی میں کتاب میلہ لگا تو ہمارے ایک وسیع المطالعہ شاعر روز پتے میں جاتے۔ بقول خادمہ گوشہ وہ اس لیے بڑے وسیع المطالعہ شاعر ہیں کیونکہ سارا سال شاعر ہوتے رہتے ہیں۔ وہ روز سنال پر اپنی کتابیں جوں کی توں دیکھ کر کہتے: ”شاعری دو قسم کی ہے۔ مقبول شاعری اور معقول شاعری اور میں نے کبھی معقول شاعر اور شاعری کبھی نہیں دیکھی۔“ ایک دن ملے تو بڑے خوش تھے۔ ہم نے پوچھا: ”کیا کوئی کتاب بک گئی؟“ بولے: ”نہیں۔ ایک چوری



سلسلہ شاعری

چند روز پہلے کی بات ہے ایک نوجوان نقاد پاک ٹی ہاؤس میں منیر نیازی پر تنقید کر رہا تھا ایک دانشور نے اس کے کان میں کچھ کہا تو وہ فوراً تعریف کرنے لگا۔ ہم نے دانشور سے ”آپ نے کیا کہا تھا؟“ وہ بولا: ”میں نے کہا تھا کہ منیر نیازی صاحب نے پتول کا لائسنس ہوا ہے۔“ ہم منیر نیازی کے واقف کار ہیں۔ کچھ کے نزدیک واقع کار اس کو کہتے ہیں جس۔ آپ اتنے واقف ہوں کہ ادھار لے سکیں اور وہ اتنا واقف نہ ہو کہ آپ سے ادھار مانگ سکے

ہوئی ہے۔ گنجی بات ہے اس سے میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ اب کوئی کسی ایسے غیرے کی کتاب تو جانے سے رہا۔ ”سواں دور میں سب سے زیادہ خطرہ ضمیر نیازی صاحب کو ہی تھا“ سو انہوں نے اپنی شاعری کی حفاظت کے لیے پستول رکھ لیا۔ ممکن ہے پستول کی حفاظت کے لیے انہیں الگ سے ملازم رکھنا پڑے۔ دیے انہیں کار اور پستول چلانا نہیں آتا۔ سو پستول چلانے کے لیے بھی انہیں کوئی نہ کوئی تو چاہیے ہو گا۔ پولیس پر انہیں اعتبار نہیں، ”دو نہ ہماری پولیس یوں حفاظت کرتی ہے جیسے پاکستان کے سابق وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان نے ایک پریس کانفرنس میں بتایا۔ ان کے ہاڈی گاڑڈ سفید پکڑوں میں پھتے تھے۔ ایک صحافی نے پوچھا: ”یہ آپ کے ساتھ جو بندہ بیٹھا ہے۔ یہ کون ہے؟“ تو سر ظفر اللہ نے اپنے ہاڈی گاڑڈ کا تحارف کراتے ہوئے کہا: ”یہ وہ بندہ ہے جو اسے شوٹ کرنے کی کوشش کرے گا جو مجھے شوٹ کرے گا۔“ تب شاعر اور ادیب پستول سے ملک کی نظریاتی اور اپنی نظر آتی سرحدوں کی حفاظت کریں گے۔ ہو سکتا ہے آئندہ مزاحمتی شاعری کی بجائے مسلح شاعری ہوئے گی۔ آنے والے دور میں تو آپ کو کسی شاپنگ سنٹر جانا ہو گا تو دو دن پہلے آپ کو وہاں کے پارکنگ لاث میں بلنگ کرانا ہوگی۔ اتنی ٹریفک ہوگی کہ سڑک کی دوسری طرف پہنچنے کا ایک ہی محفوظ طریقہ ہو گا۔ وہ یہ کہ بندہ پیدا ہی دوسری طرف ہو۔ شاعر مشاعروں میں یوں ذرہ بکتر بہن کر جائیں گے جیسے اگلے مودچوں پر جارہے ہوں۔ اب ہمیں لگتا ہے کہ یاسین قدرت صاحب مستقبل کے شاعر ہیں۔ جو غزل اور پستول اکٹھے نکالے ہیں۔ کچھ پتہ نہیں ہوتا پہلا فائرس کس کا کریں گے۔ شہزاد احمد صاحب پر پچھلے برس حملہ ہوا۔ اس کے بعد سے ان کا کوئی شعر پڑھو تو یہی لگتا ہے جیسے آپ پر حملہ ہو رہا ہے۔ ان کو پروین شاکر نے کہا تھا: ”شہزاد صاحب سنا ہے آپ بڑے بڑے لکھے ہیں مگر آپ اپنے کلام سے اس کا دوسروں کو پتہ نہیں چلے دیتے۔“ دور کے محققوں کے نزدیک تو مسلح شاعری ماضی میں بھی ہوئی رہی ہے۔ دیے ہماری شاعری میں جھری، نیزہ، تیر، بزجھی، تلوار، گولیاں اور دوسرے اسلحے کا ہیضہ ہے دروغ استعمال ہوتا رہا ہے۔ اردو شاعری میں تو اسے محبوب ہی نہیں گردانتے جو گزرتے گزرتے قتل نہ کرنا جائے۔ ایسی شاعری ہمارے پاس ہی نہیں دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی ہوئی۔ چین میں کئی شاعروں کی ایسی شاعری صوبہ ہونان کے تاریخی شہر چینگ دی میں اڑھائی کلو میٹر لمبی دیوار میں چن دی گئی ہے۔ ممکن شاعر نے لے ہوں۔ اسے دیوار نظم کا نام دیا گیا

ہے جو شہر کو سیلاب سے بچانے والے ایک پستے کے طور پر استعمال ہوگی۔ چلو شاعری سے ان کوں کا بچاؤ تو ہوا۔ محقق کوشش کریں تو ممکن ہے وہ مسلح شاعری کے ساتھ ساتھ مسلح شاعر ہی دریافت کر لیں۔ جیسے اثر لکھنؤی صاحب نے دریافت کیا کہ کوئی فلسفے اور سائنس کی فہموری ایسی نہیں جو میر کے کلام میں پوشیدہ نہ ہو۔ غالب کی سائنسی شاعری پر توسید حامد علی ٹانہ نے پوری کتاب لکھ ماری ہے، جس سے لگتا ہے Theory of Relativity غالب نے اپنے Relatives کے تنگ آکر پیش کی تھی۔ بہر حال آج کل لوگ لکھنا نہیں چاہتے نہ اسرینما ہاتے ہیں۔ حالات ایسے ہیں کہ شعر اور شیئر کے بھاؤ گرتے جارہے ہیں۔ لیکن شاعری تو ضمیر نیازی کی شریک حیات ہے۔ وہ کہتے ہیں میں نے پستول کے بغیر جو وقت گزارا وہ ضائع کیا۔ نہ ابھی بھی موقع ہے۔ وہ اپنا ماضی بہتر بنا سکتے ہیں کیونکہ جو اس پر یقین رکھتا ہے کہ ماضی بدل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ وہ ہے جس نے ابھی اپنی یادداشتیں لکھی ہی نہیں۔ مائز زندگی اللہ کی نعمت ہے اس کے بغیر تو بندہ بے کار ہے، لیکن وہ شاعر ہی کیا جو مرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ شاعر تو بہتر سرگ پر بھی کوئی اچھا چہرہ نظر آجائے تو فوراً اس پر مرنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ پھر یاسین دانوں نے تو واسطہ اس لیے رکھا ہے تاکہ عوام سے اپنے آپ کو بچا سکیں۔ دیے ممکن ہے انہوں نے اس لیے پستول لیا ہو کہ آج کل قبضہ گر روپ متنازعہ اور پبلک پراپرٹی پر قابض ہونے میں ذرا روپ نہیں کرتے اور ضمیر نیازی پبلک پراپرٹی میں بھی اور متنازعہ بھی۔

نوں میں خٹلے پانی سے نہاتے ہوئے ہماری آواز کیسی نکلتی تھی۔ گرمیوں میں یک دم گرم پانی آجانے سے اچھا خاصا عالمگیر یک دم عطاء اللہ سیٹی خیلوی ہو جاتا ہے۔ صحافت میں آکر ہم نے جب بھی کسی گلوکار کا انٹرویو کیا، سب سے پہلے اس سے یہی پوچھا کہ کیا آپ کے غسل خانے کی بھی کندی نہیں تھی؟ لیکن کچھ لوگ تو پیدا ہی گاتے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور ان کی آواز سن کر لگتا ہے جیسے کوئی پیدا ہو رہا ہے۔ نصرت فتح علی خان کہتے ہیں: ”جب میں بچہ تھا تو میرے والد کی خواہش تھی کہ میں روڈوں بھی سر میں۔ اگر سر میں نہ رہتا تو ڈانٹ پڑتی۔“ مہدی حسن خان صاحب بچپن میں ایسا سر میں روٹے کہ والدین چپ کرانے کی بجائے انہیں سننے بیٹھ جاتے۔ البتہ عطاء اللہ سیٹی خیلوی کی والدہ دھاکو فوراً چپ کرادیا کرتیں۔ ہمارے ایک پاپ سنگر کو جب پہلا گیت گانے پر پروڈیوسر نے میں رو پے دیئے تو وہ بولا: ”اس سے زیادہ تو میری والدہ دھکے چپ کرانے کے دیتی ہے۔“ نور جہاں کہتی ہیں: ”جس عمر میں بچے کھلونے کی ضد کرتے ہیں، میں گانے کی ضد کرتی۔“ سلج پر گاتے ہوئے مختار بیگم کا انداز یہ ہوتا تھا کہ وہ گاتے ہوئے دونوں ہاتھ بلند کرتیں اور اپنے جوتے اتار دیتیں۔ پتہ نہیں کیسے سننے والے ہوتے تھے جو گلوکارہ جو تاتار لیتی تھی۔ بہر حال نور جہاں مختار بیگم کے جوتے اٹھا لیا کرتی تھیں۔ ہمارے ہاں اتنا احترام ہم نے گلوکاروں کا دیکھا یا نمازیوں کا۔ لیکن شہنشاہ غزل پاکستان میں گلوکاروں کے مقام سے بھر بھی ٹالاں ہیں۔ انہوں نے مطالبہ کیا ہے کہ گانے والوں کو بھی پروفیسر کہا جائے۔ یاد رہے اس سے پہلے موسیقاروں نے استاد کہلانا شروع کیا تھا جس کے بعد سے تاتاروں نے نیچر کہلونا شروع کر دیا ہے۔ اگرچہ بظاہر لگتا ہے مہدی حسن خان صاحب ہمارے میں آگئے ہیں۔ انہیں کسی نے کہہ دیا ہے کہ پروفیسر کہلانا کوئی عزت کی بات ہے۔ ہمارے ہاں پروفیسر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک ہاتھ دیکھئے اور دوسرے دکھانے والے۔ کچھ پروفیسر عام سڑکوں پر جمع لگاتے ہیں۔ کچھ یہ معمول تعلیمی اداروں میں ہے۔ البتہ عام بول چال میں پروفیسر اسے کہتے ہیں جس کی یادداشت کمزور ہو۔ پروفیسر تو زندہ بن سکتا ہے مگر گلوکار بننے کے لیے براہِ عملہ چاہیے۔ بالخصوص مساتیوں کا کہتے ہاں تصور خانم کو کسی نے کہا: ”کوئل پکار کر کھاؤ گی تو تمہاری آواز بالکل کوئل جیسی ہو



KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

آہ۔ لات موسیقی

موسیقی سے ہمیں تب سے لگاؤ ہے جب ابھی ہم نئے نئے ہو مثل میں آئے تھے۔ لگاؤ کی وجہ یہ تھی کہ ہاتھ روزمر کی کنڈیاں نہیں تھیں۔ سو نہاتے وقت ہمیں مسلسل گاتے رہنا پڑتا تھا تاکہ باہر والوں کو پتہ چلن کہ اندر کوئی ہے۔ ہو مثل کا پانی بھی موسم کے مطابق ہوتا تھا۔ یعنی گرمیوں میں گرم اور سردیوں میں سرد۔ سو اسی حساب سے سر نکلتے۔ پچھلے دنوں ہم نے پٹھان خان کو گاتے سنا تو ہمیں یاد آگیا کہ سردیوں کے

امراض چٹا ڈاکٹر عبدالستار تارکی ماہر امراض طبلہ، سجاد علی ماہر امراض ہتھ و اعصاب اور
الاکٹر نصرت فتح علی خان ماہر امراض چینی و پیٹ اور ڈاکٹر عطاء اللہ علی خیلوی ماہر امراض
مرد درد کھلاتے۔

ہم نے ایک جرنلسٹ سے پوچھا: ”مہدی حسن کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟“
بولے: ”مجھے تو وہ بہت پسند ہیں۔ خاص کر کے ان کی شاعری۔“ ہم نے بھی مہدی حسن کی
نی غزلیں دیوان میر میں پڑھیں۔ مزہ آگیا۔ وہ شہنشاہ غزل ہیں اور ان کے ساتھ وہی سلوک
دور ہے جو جمہوریوں میں شہنشاہوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کی غزلیں سن کر ہم یوں
حیرت زدہ ہوتے ہیں جیسے کسی پروفیسر عامل سے اپنے مستقبل کا سن کر۔ مہدی حسن کہتے ہیں
”میں ایک بار اپنے شاگرد پروفیسر مہدی کو گانا سکھا رہا تھا۔ میں نے ایسی تان گائی کہ سامنے پڑا
گلاس ٹوٹ گیا۔“ ان میں اور بھی کئی پروفیسر والی خوبیاں ہیں۔ تجریدی آرٹ اتار برا نہیں
جتنا نظر آتا ہے۔ ایسے ہی کلاسیکل موسیقی اتنی بری نہیں جتنی سننے میں آتی ہے۔ ہم
فاسیکل موسیقی یوں سنتے ہیں جیسے کسی پروفیسر کی تائیں سن رہے ہوں۔ اس کے باوجود اگر
لوٹی پوچھے کہ گلوکاروں کو کیا کہا جائے؟ تو ہم یہی کہیں گے: ”انہیں کچھ نہ کہا جائے۔“

جائے گی۔“ اس نے ایسا ہی کیا اور وہ کوئل نظر آنے لگی۔ کئی گلوکاروں کی حرکتیں دیکھ
ہمارا دل کی بار انہیں پروفیسر کہنے کو چاہتا ہے، لیکن ہم نے یہ کبھی اس لیے نہیں کہا
کہیں وہ برائے مان جائیں۔

موسیقی وہ زبان ہے جو دنیا بھر میں مترجم کے بغیر سمجھی جاتی ہے۔ البتہ اس پر
حاصل کرنا مشکل ہے۔ ویسے تو دنیا بھر کی زبانوں کے ماہر اور ان پر عبور رکھنے والے کا
اپنی بیوی کی زبان پر عبور نہیں ہوتا۔ اب موسیقی سننے کے دور سے دیکھنے کے دور میں
ہے۔ جولیس گوکوٹ کی طرح لوگوں کو بھی موسیقی میں جو پسند ہے، یہ وہ حسینائیں ہیں
موسیقی سن رہی ہوتی ہیں۔ موسیقاروں کا ایک دوسرے کو داد دینے کا بھی اپنا انداز ہے
جیسے لیو پولڈ گوڈو سکی پر فارمنس دے کر باہر نکلا تو اس کے ایک مخالف گلوکار نے کہا: ”آ
رات تو آپ نے کمال ہی کر دیا۔ میں نے آپ کو اتنا اچھا گاتے پہلے کبھی نہیں سنا۔“
گوڈو سکی بولا: ”خیر یہ اتنا بھی برا نہیں تھا۔“ میڈم نور جہاں فلموں میں تب سے گانے گار
ہیں جب ابھی خاموش فلمیں ہوتی تھیں، لیکن انہیں بھی ملکہ ترم ہی کہا گیا پروفیسر
کہلا سکیں۔ ایسے ہی جیسے باسر عرفات کا برس بار برس یہ معمول رہا کہ وہ رات بستر بدا
لیتے۔ اس حساب سے انہیں قادر آف دی نیشن ہونا چاہیے تھا لیکن وہ تاحال ایک بچی
قادر ہی ہو سکے ہیں۔

ہم موسیقی کو روح کی دوا سمجھتے ہیں۔ مہدی حسن صاحب نے فرمایا تھا: ”میں،
سے کئی بیاریوں کا علاج کر سکتا ہوں۔“ سو اس لحاظ سے انہیں پروفیسر کی بجائے ڈاکٹر
چاہیے تھا۔ ڈاکٹر اور گلوکار کے نزدیک دنیا میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو کھا
ہیں اور دوسرے جو نہیں کھاتے۔ کہتے ہیں ”مکرم میں ہفتہ تو قالی کراؤ تو طبریا نہیں ہوتا۔
خالفین موسیقی اس کی وجہ یہ جانتے ہیں کہ سارے مجسمہ قوتوں کی تابیوں سے مر
ہیں۔ اگرچہ جب سے بی ایچ ڈی ڈاکٹروں کی تعداد بڑھی ہے، تب سے ڈاکٹر ہونا بھی احتیاء
طلب ہو گیا ہے۔ ازبکستان میں تو اب لیڈی ایس ڈاکٹر بھی اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر نہیں لکھتے
ویسے احتیاء کا تقاضا بھی ہے۔ آج کل پیڈلسٹ ڈاکٹروں کا دور ہے۔ پیڈلسٹ وہ ہوتا۔
جو کم سے کم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانتا ہے۔ اس حساب سے ڈاکٹر عارف لو،

باندی عائد کرنے کے ساتھ ساتھ یہ اعلان کیا ہے کہ دفاتر میں پرکشش عورتوں کو ملازمتیں نہیں دی جائیں گی۔ لگتا ہے دل کے بعد اب ملائشیا کو بھی حسن سے خطرہ ہے۔ ہم نے صوبہ کینٹین کے وزیر اعلیٰ تو نہیں دیکھے، ہمارا خیال ہے بادشاہی مسجد کے مولانا عبدالقادر آزاد کی طرح حسین ہوں گے۔ مولانا عبدالقادر آزاد جو ایک عرصے سے ذہانت اور خطاب میں مبتلا ہیں، کہتے ہیں: ”ایک وقت ایسا تھا شادی کی تقریب میں میرے حسن کی تاب نہ لا کر ایک لڑکی بے ہوش ہو کر گر پڑی تھی۔ اب تو ظالم وقت نے سب چھین لیا۔“ ایسے یہ مولانا کی کسر نفسی ہے ورنہ تو انہیں دیکھ کر کئی لڑکیاں اب بھی بے ہوش ہو سکتی ہیں۔ خیر وہ قومولوہیوں کی روزمرائیں ہیں، یعنی مولویوں میں ان کو وہی مقام حاصل ہے جو مہگازیوں میں روزمرائیں کو۔ بہر حال ملائشیا حکومت کے اس اعلان سے وہی نتیجہ نکلے گا جو اسلامی نظریاتی کونسل کے اس اعلان سے نکلتا ہے جس کے مطابق صرف 35 سال سے زیادہ عمر کی عورتوں کو ملازمتیں ملنا چاہئیں۔ عمر عورتوں کی مراد کمزوری ہے۔ ایک نارتون کے بارے میں آسکر وائلڈ نے کہا تھا: ”جب تک وہ اپنی بیٹی سے دس سال چھوٹی نظر آتی ہے گی، تب تک وہ مکمل اطمینان سے رہے گی۔“ عورتیں ہمیشہ کم عمر پسند کرتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی عمر مردوں سے ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے۔ جس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ عورتوں کی پہچانی بیوی نہیں ہوتی۔ بہر حال جس خاتون کو کہا جائے گا کہ اسے نوکری اس لیے مل رہی ہے کہ وہ 35 سال سے زیادہ عمر کی سے تو وہ نوکری لینے سے انکار کر دے گی۔ ایسے ہی صوبہ کینٹین کی عورتیں اس لیے نوکری کرنا ہی نہ چاہیں گی کہ لوگ سمجھیں گے، ”الاش نہیں۔ اس اعلان پر ملائشیا مردوں نے احتجاج کیا ہے۔ مغرب میں تو آزادی نہ ان کی تحریک بھی مردوں نے چلائی تھی تاکہ دفاتر میں وہ عورتوں کے شانے کے ساتھ شانہ ملا کر کام کر سکیں۔

اعزیز تیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جن کے آپ خواب دیکھتے ہیں اور دوسری وہ جن سے آپ کی شادی ہوتی ہے۔ آپ کہتے ہیں آرت وہ چیز ہے جو آپ کو کبھی نہیں اچھی لگے، لیکن آپ کو اس کی سمجھ نہ آئے۔ دنیا میں آرٹ کا سب سے پہلا نمونہ عورت ہے۔ کچھ نے توانا کو ایک اپ کیا ہوتا ہے کہ وہ صادقین کے آرٹ کا نمونہ لگتی ہیں۔ عورت ہونا دراصل حسین



حسین ہونا منع ہے

ہم نے ایک بار حلقہ دار باب ذوق کے اجلاس میں کہہ دیا کہ بد صورتی عورت کی سے بڑی محافظ ہے۔ تو وہاں موجود ایسی ”محفوظ“ خواتین نے ہمیں اپنے لیے خطرہ دے دیا۔ احمد ندیم قاسمی صاحب تو اپنے ایک افسانے میں لکھتے ہیں: ”جب خدا کسی غریب سے ناراض ہوتا ہے تو اسے خوبصورت بیٹی دیتا ہے۔“ کچھ ایسے ہی خیالات ملائشیا کے صوبہ کینٹین کے وزیر اعلیٰ کے ہیں جنہوں نے خواتین سرکاری ملازمت کے لپ اسٹک لگانے

ہوتا ہے۔ دنیا کا کوئی آئینہ کسی بھی عورت کو بد صورت نہیں بناتا۔ منیر نیازی صاحب تو کسی بد صورت سے ملنے پر تیار نہیں ہوتے۔ ویسے وہ جن خواتین کو سامنے بٹھا کر تعریفیں کر رہے ہوتے ہیں انہیں دیکھ کر لگتا ہے دنیا میں کوئی خاتون بد صورت ہوتی ہی نہیں۔ کچھ کہتے ہیں خوبصورتی تو اندر ہوتی ہے۔ مثلاً جام کے اندر جبیب کے اندر لباس کے اندر وغیرہ وغیرہ۔ کچھ کے نزدیک خوبصورت دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتی ہے۔ سو صوبہ کینٹین کے وزیر اعلیٰ کو اس آنکھ پر آنکھ رکھنی چاہیے تھی۔ جیسے ایک پاکستانی لڑکی نے بتایا: ”میں امریکہ میں شلووار قمیض میں دفتر جاتی تو سب کی آنکھیں میرے چہرے کو گھورتی رہتیں۔ میں نے باس سے شکایت کی تو اس نے کہا، ”مٹی اسکرٹ یا شاس پینا کرو۔ اب چھ ماہ ہو گئے ہیں۔ دفتر میں کسی نے میری آنکھ میں آنکھ ڈال کر نہیں دیکھا۔“ اگرچہ یہ یہ کہتا بھی مشکل ہے کہ کوئی لڑکی دلکش ہے، کون سی نہیں۔ روس میں اس کا یہ طریقہ ہے کہ بازار یا ہوٹل میں جس سٹریٹرز ل سے گاہک بٹاتا ہے وہ سمجھتی ہے اب میں دلکش نہیں رہی۔

ہو سکتا ہے حکومت کا دفاتر میں حسن پر پابندی لگانے کا فیصلہ اصل میں بیوٹی پارلرز کے خلاف مہم ہو۔ جو شخص کہے کہ عورتوں میں خوبصورتی کم ہوتی جا رہی ہے۔ یقین کر لیں وہ کسی بیوٹی پارلر میں کام کرتا ہے۔ وہاں کام کرنے سے بندے کا بیوٹی سے یقین اٹھ جاتا ہے اور محنت پر یقین آ جاتا ہے۔ دنیا کو اتنا حسن شاعروں، موسیقاروں نے نہیں دیا جتنا بیوٹی پارلوں والوں نے دیا ہے۔ البتہ اگر بیوٹی ہفتہ بیوٹی پارلر سے دور رہے تو اسے یہ بھی نہ ہوگا کہ محلے میں کیا ہو رہا ہے۔ عورتیں معجزوں پر یقین رکھتی ہیں۔ یقین نہ آئے تو کسی بیوٹی پارلر میں چلے جائیں۔ ہماری ایک عزیزہ لطیفہ بہت گفرتی رہتی ہیں۔ پچھلے دنوں ہم نے اس کے چھوٹے بھائی سے پوچھا: ”وہ اب بھی لطیفہ بناتی ہے؟“ تو وہ بولا: ”نہیں۔ اسے تو بیوٹی پارلر کی ملازمت چھوڑنے عرصہ ہو گیا ہے۔“ فرانس کا اتنا دفاعی بحث نہیں ہوتا جتنے کا ہر سال فرانسیسی عورتیں میک اپ کرتی جاتی ہیں۔ لیکن میک اپ پر پابندی خواتین کو غیر مسلح کرنے کے مترادف ہے۔ ملائیکہ حکومت کے اس اعلان کے بعد اب وہاں ماں باپ اپنے بچوں کی شادی کرنے کے لیے جو ضرورت رشتہ کا اشتہار دیں گے ان میں لکھا ہوگا کہ ہماری بیٹی اتنی حسین ہے کہ کئی دفاتر نے اسے نوکری دینے سے انکار کر دیا ہے۔ ویسے تو

ہماری خواتین کی طرح ملائیکہ کی خواتین کو بھی مردوں سے زیادہ آسائیاں حاصل ہیں۔ جیسے کئی مرد ایک عورت سے شادی نہیں کر سکتے جب کہ کئی عورتیں ایک مرد سے شادی کر سکتی ہیں۔ اب وہاں صرف بیوٹی کی جاب ایسی رہ گئی ہے جس پر خوبصورتی کو ترجیح ملے گی، لیکن کچھ خواتین صرف آٹھ گھنٹے والی جاب چاہتی ہیں۔ جہاں تک اب اسٹک کا تعلق ہے تو اسے ہوٹلوں کا لباس سمجھتے رہے، لیکن صوبہ کینٹین کے وزیر اعلیٰ اسے وہ اسٹک سمجھتے ہیں جس سے عورتیں مردوں کو کنٹرول کرتی ہیں۔ اب لپ اسٹک لگانا وہاں غیر اخلاقی حرکت ہے۔ جیسے ڈنمارک میں عورتوں کا موٹا ہونا غیر اخلاقی حرکت ہے۔ جب کہ ہمارے ہاں ان حرکتوں سے پشتو فلم بنتی ہے۔

اگرچہ لپ اسٹک پر پابندی لگانے سے زرمبادلہ بیچے گا کیونکہ صرف صوبہ کینٹین کے مرد روزانہ لاکھوں کی لپ اسٹک کھا جاتے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہاں کے مردوں نے اس کی حمایت میں کوئی جلوس نہیں نکالا۔ صرف اخباروں نے ہی ”سرخمی لگانے پر پابندی“ کی سرخی لگائی۔

ضرورت رشتہ کے اشتہار دیکھیں جن میں اکثر یہ لکھا ہوتا ہے کہ کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی
 نے لیے ڈاکڑ یا انجینئر یا سرکاری ملازم کا رشتہ درکار ہے۔ یہ نہیں لکھا ہوتا کہ سرکاری ملازم
 نے 17 کا ہوا بیٹے کا کیونکہ انہیں پتہ ہے گریڈ جو بھی ہو گا اوپر کی آمدنی کافی ہوگی اور لڑکی
 نہ شرمے گی۔ اسی لیے ضرورت رشتہ کے اشتہار میں کبھی کسی سیاستدان کی ڈیمانڈ نہیں
 ہوتی۔ اس تحقیق سے تو لگتا ہے وہ برسوں سے ضرورت رشتہ کے اشتہار ہی پڑھ رہے ہیں۔
 ایسے بھی یہ اشتہار کنواروں سے زیادہ شادی شدہ پڑھتے ہیں، لیکن لایک صاحب کے بیان کے
 بعد تو ضرورت رشتہ کے اشتہاروں کے مطالعہ کے لیے الگ سے سرشتہ چاہیے۔ کم از کم
 مغل انٹی کرپشن کو تو یہ اشتہار زبانی یاد ہونے چاہئیں۔

کرپٹ کا لفظ ہمارے ہاں استعمال ہو کر اب اتنا کرپٹ نہیں رہا جتنا شروع میں ہوتا
 تھا۔ کرپشن کس نے شروع کیا؟ اس پر بے نظیر اور نواز شریف دونوں میں مکمل اتفاق
 رائے ہے۔ جب نواز شریف سے ان کے دور حکومت میں یہ پوچھا گیا تو انہوں نے کہا:
 ”چھٹی حکومت نے۔“ اب بے نظیر بھٹو بھی یہی کہتی ہیں۔ ٹریفک اڈو سیاست کے
 حادثے میں یہ فرق ہوتا ہے کہ ٹریفک کے حادثے میں مجرم وہ ہے جو زندہ بچ جائے اور
 سیاست میں اس کے الٹ ہوتا ہے۔ ہماری تو حکومت خود ایسے چل رہی ہے جیسے ہماری
 ٹریفک۔ لیکن کچھ لوگوں کی خواہشیں اس دور حکومت میں آکر پوری ہوئیں جیسے ہمارے
 ایک دوست کی خواہش تھی کہ اس کے پاس مہنگی گاڑی ہو اور وہ کسی مہنگے فلیٹ میں رہے۔
 اس کی دونوں خواہشیں پوری ہو گئی ہیں۔ سوزو کی مہنگی ہو گئی ہے اور اس کے مالک مکان
 نے کرایہ ڈبل کر دیا ہے۔

سیاستدان دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو سیاست میں کچھ کرنے آتے ہیں اور
 دوسرے وہ جو کچھ بننے آتے ہیں۔ ہمارے سیاست دانوں کو وطن نے جو دیا اس کا تصور
 نہیں کیا جاسکتا۔ اور انہوں نے وطن کو جو دیا اس کا بھی تصور نہیں کیا جاسکتا۔ سو کے
 نوٹ پر قائد اعظم کی جو تصویر ہے، اب تو اس میں وہ نوٹ رکھنے والے کے ساتھ آنکھ
 نہیں ملا رہے۔ جس سے لگتا ہے کہ اب انہیں بھی پتہ چل گیا ہے کہ یہ نوٹ زیادہ کن
 لوگوں کے پاس ہیں۔ ازبیک زبان میں معیشت کا مطلب عیش و عشرت ہے۔ ہمارے



ضرورت سر رشتہ

وہ تحریر جسے ایک کالم نگار لکھتا ہے کالم ہوتی ہے۔ ایسے ہی وہ حرکت جو ایک سیاستدان
 کرے سیاست کہلاتی ہے۔ اگرچہ سابق وفاقی وزیر عبداللہ ملایا اپنی حرکات کی وجہ سے
 اتنے مشہور نہیں جتنے سکناٹ کی وجہ سے ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے کرپشن کی پیٹنگ کا
 جدید طریقہ دریافت کر کے ہمیں اتنا حیران کیا ہے کہ ہم تب سے انہماک کے ہمارے مگر
 دریافت کر رہے ہیں۔ انہوں نے تحقیق کے بعد کہا ہے: ”کرپشن کی چیٹنگ کے لیے آپ

عکمرانوں نے عیش و عشرت کو معیشت بنادیا۔ ہمارے ایک جاننے والے اسلام آباد میں افسر ہیں۔ ہم نے ان سے پوچھا: ”نئے سیاسی لیفٹے نے؟“ بولے: ”نئے کیا مطلب! ایک دو کے ساتھ تو میں نے کام بھی کیا۔“ سیاست دانوں کے بارے میں لوگوں کی رائے ایسی ہے کہ ایک بزرگ سیاستدان پاؤں بچھلے سے گر پڑے۔ ان کا ورک پاس کھڑا آرام سے دیکھتا رہے۔ ہم نے وجہ پوچھی تو بولا: ”میں انہیں جانتا ہوں، کچھ دیکھ کر ہی گرے ہوں گے۔“ جہاں تک سیاست دانوں کی ضرورت رشتہ کے اشتہاروں میں ڈیماٹڈ نہ ہونے کی وجہ ہے۔ یہ وہ بھی ہو سکتی ہے جو اداکار درشیم نے اپنے انٹرویو میں کہی ہے کہ میرا لہا فلم انڈسٹری سے نہیں ہوگا بلکہ میں کسی تعلیم یافتہ اور مہذب شخص سے شادی کروں گی۔ ویسے یہ بھی نہیں کہا جاسکتا ہے کہ ضرورت رشتہ کے اشتہاروں میں سیاست دانوں کا کوئی سکوپ ہی نہیں ہوتا۔ کئی اشتہاروں میں لکھا ہوتا ہے کہ دوسری شادی اور بچوں والے بھی رابطہ کر سکتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں ہر شادی کامیاب ہوتی ہے۔ ناکام تو بعد میں ایک دوسرے کے ساتھ رہتا ہوتا ہے۔ سیاست دان تو اس لیے بھی طلاق نہیں دیتے کہ ایک ووٹ کم ہو جائے گا۔ کچھ تو اسی طرح ایک ایک کر کے ووٹ بڑھاتے ہیں۔ دونوں اور دونوں میں اضافہ کرنے والے ایک سیاست دان کے بارے میں یہ چلا کہ وہ بچپن ہی سے اسنے تیز تھکے کہ بیک وقت دو دور ختوں پر چڑھ سکتے تھے۔ پاکستان میں شادی کے اشتہارات شاید اس لیے چھپتے ہیں کہ یہاں آپ لڑکی کے والد سے اس کا ہاتھ مانگتے ہیں۔ کئی مغربی ملکوں میں تو ہالی وڈ کی طرح لڑکی کے خاوند سے اس کا ہاتھ مانگتے ہیں۔ انگریزی زبان میں تو ویسے بھی طلاق شادی سے پہلے آتی ہے۔ وہاں ایک معروف جوڑے کی شادی ہو جائے تو کیوں کا ایک جوڑا خوشحال زندگی گزار سکتا ہے۔ ہالی وڈ میں اگر جوڑا چرچ سے شادی کے بعد اکٹھا رہا لکھ لکھ کر سوچا جاتا ہے شادی چلنے کے چانسز ہیں۔ کہتے ہیں ایک چالاک آدمی کو ایک امین عورت بھی سنبھال سکتی ہے، لیکن ایک بے وقوف کو سنبھالنے کے لیے بڑی عقل مند عورت چاہیے۔ سیاست دانوں کی ڈیماٹڈ شاید اس لیے بھی کم ہوتی ہے کیونکہ ان کی تو بات پر بھی تب تک یقین نہیں کیا جاسکتا جب تک وہ اس کی باضابطہ تردید نہ کر دیں۔ آپ کسی عام بندے سے جان چھڑانا چاہتے ہیں تو

اسے قرض دے دیں وہ پھر آپ کو نظر ہی نہ آئے گا اور اگر کسی بڑے آدمی سے یہ چاہتے ہیں تو اسے ووٹ دے دیں پانچ سال آپ کے حصے نہ لگے گا۔ سیاست دان کبھی وہ نقصان نہیں اٹھاتا جو وہ نہ اٹھانا چاہے۔ آج کل بندوں کو جس بات پر شک ہو، کہتے ہیں اس میں کوئی سیاست ہے۔ سو شادی کے اشتہاروں میں سیاست دانوں کی ڈیماٹڈ ہونا بھی ایک سیاست ہے۔ کیونکہ سیاست دان تو ہمارا اقوی سرمایہ ہیں اور شاید یہ سرمایہ پاکستانی کرنسی میں ہے۔ اسی لیے دن بدن ان کی ویلیو کم ہو رہی ہے۔ ہم نے جب بھی تجزیہ مصوری دیکھی، وہ کسی مجر کی تخلیق تھی۔ سیاست بھی ہمیں تجزیہ آرٹ لگتی ہے۔ جیسے اکثر اداکار کہتے ہیں کہ ہماری تو فن سے شادی ہو چکی ہے۔ ایسے ہی سیاست دانوں کی اصل شادی تو سیاست سے ہوتی ہے۔ کم از کم سیاست کے ساتھ ان کے سلوک سے تو ہمیں یہی لگتا ہے۔

بہیز کرنا، ورنہ بھول جاؤ گے کہ کس کام آئے تھے۔ انتظار صاحب ماضی کے انتظار میں رہتے ہیں۔ انہیں پرانی چیزیں اچھی لگتی ہیں۔ ہم سمجھتے تھے یہی ان کی خوشگوار اور ادبی زندگی کا راز ہے لیکن سزا انتظار حسین نے اور ہی بات بتائی ہے۔ ایک ہفت روزے کو انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے کہا: ”میں نے کبھی انتظار کے افسانے نہیں پڑھے۔“ مزید کہتی ہیں: ”جب مجھے پتہ چلا کہ ان سے میری شادی ہو رہی ہے تو پہلے میں نے انتظار کر دیا کہ ایسے شخص سے شادی نہیں کروں گی جو شہر کے گھروں کے احاطہ گننا پھرے۔“ صاحب ہمیں انتظار حسین صاحب کے ان مشاغل کا تو پتہ نہیں، البتہ ان کی افسانہ نگاری کے قائل ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں ایسے افسانہ نگار میں ایسے خاندان بننے کی بڑی صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ کیونکہ رات دیر سے گھر آنے پر ہر روز نئی کہانی زیادہ آسانی سے بنا سکتا ہے۔ یاد رہے کہانی یا افسانے اور حقیقت میں یہ فرق ہے کہ کہانی یا افسانہ بے حکا نہیں ہوتا۔ البتہ تجربہ دی افسانہ وہ ہوتا ہے جسے کے لیے لکھنے والے کو بھی اسے کئی دفعہ پڑھنا پڑتا ہے۔ کچھ کاغذ شاعرانہ خیال ہے کہ اگر خاتون تین ہزار مہینے کے لے کر گھر کا کام کرے گی تو یہ نوکری ہوگی۔ اگر اس کے بغیر کرے تو یہ شادی ہے۔ انتظار حسین صاحب ایسی شخصیت ہیں کہ میاں بیوی بیٹھے ہوں تو پوچھنا پڑتا ہے کہ تم دونوں میں سے میں کون ہے؟ سزا انتظار حسین سخت نہیں ہیں ورنہ انتظار حسین صاحب کو کشور ناہید سے پردہ کرواتیں۔ کشور ناہید اور انتظار حسین کے ایسے تعلقات ہیں کہ کبھی وہ کشور کی بات مان لیتے ہیں۔ کبھی کشور اپنی بات منوالہتی ہیں۔ کشور ناہید ادب کی مردانہ آواز ہیں۔ ایک نجی تقریب میں انتظار صاحب کو ”مصرفہ“ نے ڈانٹ دیا تو سزا انتظار نے براہمانتہ ہوئے کہا کہ آپ نے انہیں یوں ڈانٹا۔ یہ میرے خاوند ہیں۔

ہماری ادبی تاریخ شاعروں، ادیبوں کی بیویوں کی شکایتوں سے بھری ہوئی ہے۔ اگرچہ شادی کی اپنی بڑی خوبیاں ہیں، بندے میں وفاداری، قوت برداشت خود پر قابو پانے کی صلاحیت اور دوسری بہت سی خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں، جن کی بندے کو ضرورت ہے نہ ہوتی اگر اس کی شادی نہ ہوتی۔ ہم اکثر سوچتے تھے شاعروں اور



انتظاریر

انتظار یہ صاحب ہمارے وہ افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوں کا انتظار ہوتا ہے۔ ایسے ادیب کہ بندہ ان سے آلوؤں کا بھاد پوچھے تو اس کا جواب دیں گے، وہ ادب ہوگا۔ جیسے جین جانے والوں کو بریف کیا جاتا ہے کہ وہاں مزاحیہ بات نہ کرنا کیونکہ چینیوں کا مزاح اتنا مختلف ہے کہ میزبان آپ کی مزاحیہ تہمت سے برا مانا سکتا ہے۔ ایسے ہی انتظار حسین سے ملنے جانے والوں کو سمجھایا جاتا ہے کہ ان سے ادبی گفتگو سے

ایہ شاعروں، ادیبوں کی بیویوں کے لیے مشعل راہ ہے کہ اگر وہ کامیاب ازدواجی نی چاہتی ہیں تو خاوند کی تخلیقات پڑھنے سے پرہیز کریں۔ ہمیں اپنے بے شمار ادیب آرہے ہیں جن کی طلاقیں ہو چکی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ وجہ یہی ہوگی کہ ان کی بیویوں نے ان کی تحریریں پڑھ لی ہوں گی۔ برنارڈ شائع کہا تھا کہ رائٹر کی تحریریں ان کی ازدواجی زندگی بنانے کی بجائے بگاڑنے میں زیادہ اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ خاص کر ان وہ تحریریں جنہیں وہ پوسٹ کرنا بھول جاتے ہیں۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ادیبوں کی تحریروں میں اتنا سوز و گداز کہاں سے آتا ہے۔ جب سے ان کے فیملی چھینے لگے ہیں۔ تب سے کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا ہے۔ ایک تحقیقی رپورٹ کے مطابق شادی شدہ کنواروں سے پانچ سال زیادہ زندہ رہتے ہیں۔ صاحب پانچ سال بچانے لیے ساری زندگی صرف کر دیتا اگرچہ کوئی عقل مندی نہیں، بہر حال کہتے ہیں شادی شدہ شاعر کنوارے شاعر سے زیادہ زندہ رہتا ہے۔ البتہ افسانہ نگار کے بارے میں نہیں کہا گیا۔ تاہم جن شاعروں، ادیبوں کی ازدواجی زندگی کامیاب رہی، ان میں بیشتر وہ ہیں جن کی بیویاں خاوندوں کی تحریریں نہیں پڑھتی تھیں۔ ہمارے ہاں تو بھی تب تک دوسرے کی تحریر نہیں پڑھتے جب تک انہیں اس پر سرتے کا گمان ہو۔ رائٹر کی بیوی اگر اس کی تحریریں نہ پڑھے تو بندہ آسانی سے لکھتا ہے۔ شاید اسی لیے انتظار حسین آج بھی ویسا ہی لکھ رہے ہیں جیسا انہیں لکھنا چاہیے۔ ہم تو انہیں تب اردو کا بہت بڑا افسانہ نگار مانتے تھے، جب ابھی ہم نے ان کے افسانے نہیں پڑھے تھے۔ ان کے افسانے پڑھنے کے بعد بھی ہم نے اپنی رائے نہیں بدلی۔ ہمیں ان کے افسانے اس قدر پسند ہیں کہ رات کو جب تک ان کی کوئی کتاب نہ کھولیں، نیند نہیں آتی۔ لیکن ہم مکمل طور پر انہیں کبھی نہ پڑھ سکے کیونکہ جب بھی ہم پڑھنے لگتے ہیں کوئی نہ کوئی آکر ہمیں جگا دیتا ہے۔ ان کے خیالات ڈارون کے برعکس ہیں۔ ڈارون کو پڑھو تو وہ کہتا ہے انسان بندہ سے بنا ہے۔ انتظار حسین کو پڑھو تو لگتا ہے انسان بندہ بنا رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں افسانہ تب بھی ہوتا تھا جب افسانہ نگار بھی نہیں ہوا تھا۔ آج کل بھی ہمارے محلوں میں جو ”افسانے“ مشہور ہوتے ہیں، وہ سارے افسانہ نگاروں کے تو نہیں ہوتے۔

بیگم انتظار حسین نے کہا: ”اگر وہ لا پروا نہ ہوں تو ہیرا ہیں۔“ جس پر انٹرویو لینے والے صحافی نے کہا: ”گویا لا پروا ہیں، ہیرا نہیں۔“ صاحب ہمیں دکھ ہوا کہ انتظار حسین ہیرا بننے سے بال بال رہ گئے۔ محترم نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ انتظار حسین سننے بھی کم ہیں۔ ہم سمجھتے تھے انتظار حسین صرف بولتے ہی کم ہیں۔ بہر حال اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انتظار صاحب طرز افسانہ نگاری نہیں، صاحب طرز شوہر بھی ہیں۔ یہ

مسلمان رشتی نے اپنی کتاب Imaginary Homeland میں لکھا ہے: ”اگر مجھے ووٹ دینا ہو تو میں بے نظیر بھٹو کے حق میں ووٹ دیتا۔“ شیخ رفیق صاحب سگ رشتی ہیں۔ ویسے بھی انسان کتے کا بہترین ساتھی ہے۔ شیخ صاحب کا کتا بواڑ ہیں جس کی ذہانت کے ہم اسی دن قائل ہو گئے تھے جس روز اس نے شیخ رفیق کو کات لیا تھا۔ بقول مجھے کتے نے ان کا اخبار میں ایک بیان پڑھ لیا تھا۔ بہر حال شیخ صاحب فرماتے ہیں کہ ان کا کتا اس قدر ذہین ہے کہ ان کے گھر پجارو والے آئیں تو ان کا بواڑا حرام کرتا ہے۔ کوئی عام گاڑی میں آئے تو اسے ایک نظر دیکھ کر سر جھکا لیتا ہے۔ کوئی موٹر سائیکل والا آئے تو اس پر خوب بھونکتا ہے۔ اگر کوئی پیدل آجائے تو اسے کانٹے کا نوڈ ڈرتا ہے۔ اگرچہ اس سے توہین لگتا ہے کہ سگ رشتی پہلے ٹریفک پولیس میں رہا ہے۔ ان چاب سے تو شیخ صاحب کا اپنے گھر میں پیدل پھرنا مشکل ہو گیا ہو گا۔ ویسے تو وہ گاڑی میں بیٹھے ہوئے بھی ”پیدل“ ہی لگتے ہیں۔

سیاست دان اور اداکار کتوں کے بڑے فیورٹ ہوتے ہیں۔ بعض سیاستدانوں کے گھر جاؤ تو ان کے ہاں چپ کو کتے نظر نہیں آتے، لیکن ان کے رویے سے لگتا ہے کہ ان کے ہاں ہیں ضرور۔ سابق صدر ریش کا کتا تو ان کے بقول کتنوں سے زیادہ خارجہ پالیسی کا علم رکھتا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ خوبی شیخ صاحب کے کتے میں بھی ہو۔ شیخ صاحب بھی خارجہ پالیسی پر بول رہے ہوں تو دوسرے سمجھتے ہیں یہ پالیسی پر بات کر رہے ہیں۔ سپر ماڈل سینڈی کرافورڈ تو وال کلبر کے ساتھ اپنی ”عبوری شادی“ میں اس شرط پر رہ رہی ہے کہ اگر اس کے تین کتے ایک ملی اور ایک گھوڑا وال کے کتوں اور سور کے ساتھ مفاہمت کر لیں تو وہ شادی کر لیں گے۔ ہم بھی اس حق میں ہیں کہ حیوانات کے ساتھ انسانی سلوک نہیں ہونا چاہیے۔ سیاست دانوں کو انہیں اپنی تقریریں نہیں سنانا چاہئیں۔ ایک زمانے میں کتا کیوں والے ریکارڈ پر بیٹھا گیت سنا کرتا تھا جس پر لکھا ہوا تھا: ”ہنرماسٹر زوانس“ پھر ایسے ایسے گانے والے آئے کہ کتا ریکارڈوں سے غائب ہو گیا۔ اسی وجہ سے کئی کتے سیاست دانوں کے گھروں سے بھی غائب ہوئے، لیکن شیخ رفیق کا کتا بواڑا لگتا تھا۔ وہ سیاست بھی سمجھتا ہے۔ شیخ صاحب کو سیاست اپنے کتے سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ خود فرماتے ہیں سہاگ رات کو کمرہ عروسی میں جا کر اپنی اہلیہ فردوس رشتی سے پوچھا: ”نواب ممدوٹ کو جاتی ہو؟“ اس نے کہا: ”ہاں۔“ تو شادی چلی۔



خواجہ سگ پرست

چیلز پارٹی کے خواجہ نصر الدین یعنی شیخ رفیق کو ہم نے جب بھی دیکھا، کھاتے دیکھا یا بولتے ہوئے۔ ان کی باتیں باسرو پیا ہوتی ہیں یعنی ان میں بھی سری پایوں کی لذت ہے۔ اسی لیے دیر سے ہضم ہوتی ہیں۔ جیسے ان کا یہ بیان کہ اگر میرے کتے کا ووٹ ہوتا تو مجھے ہی ووٹ ڈالنا۔ اگرچہ یہ جملہ شیخ صاحب سے کہیں زیادہ کتے کی تعریف میں ہے۔ ہاں اگر کتا خود کہتا کہ میں شیخ صاحب کو ووٹ دوں گا تب شیخ صاحب اس پر فخر کر سکتے تھے، جیسے

جب پنجاب میں نظام مصطفیٰ کے بجائے نظام مصطفیٰ کھڑا تھا، ان دنوں شیخ رفیق کے ایک اور کرنے سہاگ رات کو کمرہ عروسی میں جا کر بیوی سے پوچھا: ”کھر کو جاتی ہوا“ تو مختصر مددے موصوف کو جلد عروسی سے باہر نکال دیا اور صبح ہوتے ہی طلاق لے لی کہ تم نے آخر مجھے سمجھا کیا ہے؟ شیخ رفیق صاحب گھریوں چلاتے ہیں جیسے پارٹی چلا رہے ہوں۔ کھانا خود پکاتے ہیں۔ روزانہ صبح اٹھ کر دس فٹ کی بلندی سے چھلانگ لگاتے ہیں۔ ہم نے جب بھی ان کا بیان پڑھا، ہمیں یہی لگا وہ روزانہ کافی بلندی سے نیچے گرتے ہیں۔ معصوم آدمی ہیں، سنا ہے ایک بار کسی عرب ملک گئے تو آکر بتانے لگے میں وہاں اتنا مشہور ہوں کہ ابھی ایئر پورٹ سے باہر ہی نکلا تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور نے دور سے مجھے پہچان کر میرا نام لے کر بلانا شروع کر دیا۔“ رفیق یار رفیق! بازار گیا تو بیشتر دکاندار مجھے پہچان کر میرا نام لے کر مجھے بلاتے رہے۔

شیخ صاحب فرماتے ہیں: ”میری ففٹس کاراز یہ ہے کہ میں نے اڑھائی سال تک والدہ کا دودھ پیا۔ اس دوران میں چلا اور نہ ہی بولا۔ میری والدہ ہمیں کہ اس کی پیدائش کا کوئی فائدہ نہیں۔ والدہ مجھے ایک پیر کے پاس لے گئیں جس کی دعا سے میں نے بولنا شروع کر دیا اور یہ سلسلہ آج تک نہیں رکا۔ آج میں اس پیر کو ڈھونڈ رہا ہوں کہ میرا بولنا بند ہو۔“ وہ ہی کیا ہم بھی اس پیر کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ شیخ صاحب کی ناک بھی ایسی ہے کہ اتنی دکھائی نہیں دیتی جتنی سنائی دیتی ہے۔ وہ کاغذی مقرر نہیں، اصلی مقرر ہیں۔ کاغذی مقرر وہ ہوتا ہے جس کے پاس جب کاغذ ختم ہو جاتے ہیں، تو پتہ چل جاتا ہے کہ اس کی تقریر ختم ہو گئی ہے اور اصلی مقرر وہ ہوتے ہیں جن کے بارے میں وہ خود یا خدا ہی جانتا ہے وہ کب بات ختم کریں گے۔ ہو سکتا ہے شیخ صاحب کتوں کے دوٹ بنوانے کی کوشش کریں لیکن ڈر ہے مصطفیٰ کھر اور شیخ صاحب ان کی نمائندگی سے محروم رہ جائیں گے کیونکہ سیاست بڑا اکٹا کام ہے۔ اس میں تو لوگ یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کرتے کہ کوئی کیوں بھونیک رہا ہے۔ بس وہ اسے کتے کا نام دے دیتے ہیں۔



بیمارستان

جب ڈاکٹر موجودہ حکومت کے خلاف احتجاج کرتے ہیں تو ہمیں حیرت ہوتی ہے یونکہ جتنا اس حکومت نے ڈاکٹروں کی بھلائی کا اہتمام کیا ہے اور کسی حکومت نے نہ کیا ہو گا۔ برائیاں ہی دیکھ لیں تو لگتا ہے عوام کی بھلائی کے لیے نہیں بنائی گئیں بلکہ آرتھوپیدک ڈاکٹروں کے لیے ہیں۔ پاکستان سیاست دانوں، مجرموں اور ڈاکٹروں کی جنت ہے۔ ڈاکٹروں کے نزدیک انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک جو بیمار ہوتے ہیں۔ اور دوسرے وہ جنہوں نے

ہیں۔“ اعداد و شمار کے مطابق ہمارے ہاں روزانہ 1000 مرد سگریٹ نوشی ترک کرتے ہیں۔ ان میں سے 999 وہ ہوتے ہیں جو ایک روز قتل بھی کیے گئے ہوتے ہیں۔ ہمارے ایک عزیز نے اپنے پندرہ سالہ لڑکے سے کہا: ”بیٹا وعدہ کر دو۔ جب تم سگریٹ شروع کر دو گے تو خود ہی مجھے بتا دو گے۔“ تو وہ بولا: ”آپ پریشان نہ ہوں۔ میں نے کل سے سگریٹ نوشی ترک کر دی ہے۔“ لیکن نئی تحقیق کے مطابق تو بے روزگاروں کی سگریٹ نوشی ختم کرانے کی ایک ہی صورت ہے کہ انہیں روزگار ملے۔ بے روزگاری عمر بھی کم کرتی ہے۔ ویسے اگر آپ لمبی عمر چاہتے ہیں تو وہ کچھ کرنا بند کر دیں جو آپ کرنا چاہتے ہیں اور وہ کچھ کریں جو آپ نہیں کرنا چاہتے۔ کہتے ہیں وہ پیشہ جس میں سب سے زیادہ جان کا خطرہ ہوتا ہے، وہ بے روزگاری ہے۔ اگرچہ اس بات کی ہمیں سمجھ نہیں آئی۔ جس بات کی ہمیں سمجھ نہیں آئی، وہ یقیناً کوئی سمجھ والی بات ہی ہوگی۔ ہم بائنگ کو دنیا کا سب سے وحشیانہ ٹھیل سمجھتے ہیں۔ ایک تحقیق نے اعداد و شمار کی روشنی میں ثابت کیا کہ دنیا کا سب سے وحشیانہ ٹھیل تاش ہے۔ آج تک جتنے لوگ اس میں زخمی ہوئے ہیں اتنے بائنگ میں نہیں ہوئے۔

سگریٹوں کے بارے میں ہماری رائے ایسی ہے جیسی لوگوں کی ہمارے بارے میں۔ بے نظیر بھونے اپنے ایک کالم میں لکھا تھا چالیس سال تک بندہ گوشت کھاتا ہے اور چالیس سال کے بعد گوشت بندے کو کھاتا ہے۔ ایسے ہم سمجھتے ہیں پہلی ڈبلی سگریٹ بندہ پیتا ہے اور اس کے بعد سگریٹ بندے کو پیتا ہے۔ سگریٹ نوشی کی پیاریوں کا باعث ہے جن میں جگر، دل اور دماغ نمایاں ہیں، لیکن سگریٹ نوشی بڑھاپے کا علاج بھی ہے جبکہ ہمارے ہاں ہر کسی کی خواہش ہوتی ہے کہ بڑھاپا بہت طویل ہو۔

ہمارے ہاں بے روزگار ہونا اتنا بھی آسان نہیں، اس کے لیے پہلے بڑھاپا لکھا ہوتا ضروری ہے۔ اگرچہ ملک سے بیروزگاری کم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ تمام یونیورسٹیوں اور کالجوں کو چند سالوں کے لیے بند کر دیا جائے۔ اس وقت پاکستان میں 17 لاکھ 80 ہزار سے زائد بے روزگار ہیں، لیکن اس کے باوجود کہا جاتا ہے کہ ہر پاکستانی کی اوسط آمدنی میں اضافہ ہوا ہے۔ ویسے جہاں تک لفظ اوسط کا تعلق ہے، یہ بڑا اوسط درجے کا لفظ ہے۔ مشہور ماہر معاشیات والٹر ٹیلر کہتا ہے کہ جب کوئی ماہر شہادت اوسط کا لفظ استعمال کرتا ہے تو اس کی

بیمار ہوتا ہوتا ہے۔ نیا ڈاکٹر وہ ہوتا ہے جس کے پاس کوئی پرانا مریض نہیں آتا۔ ہیشملہ ڈاکٹروں کے پاس آنے والے مریضوں کا پہلے تعلق غریب طبقے سے نہیں ہوتا۔ ہیشملہ ڈاکٹر وہ نہیں ہوتا جو ایک مرض کا علاج کرتا ہے بلکہ وہ ہوتا ہے جو ایک مریض کا علاج کر رہا ہے۔ جب ڈاکٹروں کی تعداد بڑھے تو مریضوں کی تعداد بڑھنے لگتی ہے۔ سائنس نے بروترقی کی لیکن اتنی دوائیاں دریافت نہیں کیں جتنی بیماریاں کی ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ جدید تحقیق کے مطابق بے روزگار رہنا بھی ایک بیماری ہے اور ایک دن بے روزگار رہنا دس پیکہ سگریٹ پینے کے برابر ہے۔ یعنی دونوں صورتوں میں جسمانی اور ذہنی بیماریاں ایک سی ہو ہیں۔ یوں اس خبر سے پتہ چلا کہ ملک میں جو 17 لاکھ 80 ہزار بے روزگار ہیں وہ سر ڈاکٹروں کا روزگار ہیں۔

پاکستان وہ ملک ہے جہاں ملازمتوں پر اکثر پابندی ہوتی ہے۔ ورنہ حکومت کے لیے کو روزگار دینا کون سا مشکل ہے۔ اسے وزیر پرستی ہے۔ سابقہ حکومت میں ایک ور کرنے کے مجھے نوکری دیں۔ صاحب اقتدار بولے: ”کوئی جاب خالی نہیں۔ جب کوئی سیٹ لنگھ گی ا سب سے پہلے تمہیں نوکری ملے گی۔“ کارکن نے ضد کی کہ آپ نے تو کہا تھا کہ حکومت میرا کر ہر صورت نوکری دلاؤں گا تو صاحب اقتدار نے کہا: ”تمہاں ابھی ایک کمیٹی تشکیل دیتا ہوں جو یہ پتہ کرے کہ نوکریاں کم کیوں ہیں اور تم اس کمیٹی کے چیئرمین بن جاؤ۔“ یا رہے بے روزگار اسے نہیں کہتے جو کچھ نہیں کر سکتے کہ نوکری نہ کرنے والوں کی فہرست بنائی جائے تو ہر دس میں سے سات سرکاری ملازم ہوں گے۔ بے روزگار رہنا آسان نہیں۔ اس میں کام کرنے سے کہیں زیادہ توانائی خرچ ہوتی ہے۔ تاہم اس تحقیق سے یہ پتہ چلا کہ بے روزگار ہونا بے کار نہیں، روزانہ سگریٹ کی کئی ڈبیوں کا خرچہ بچاتا ہے۔ سگریٹ کے بارے میں ہماری بھی پہلی رائے ہے کہ اس کے ایک سرے پر شعلہ اور دوسرے پر ایک بے وقوف ہوتا ہے۔ ایک دانشور نے بتایا کہ ایک دن میرا بیٹا کہنے لگا: ”ابو آپ ہر روز درجنوں مرتبہ کاغذ کے ٹکڑوں کو آگ لگا کر مرنے میں کیوں ڈال لیتے ہیں؟“ اسکو دلائل کی ایک کردار لیزہ بریلیکل کہتی ہے: ”جب کوئی مرد مجھے کہتا ہے کہ وہ سگریٹ پیتا ہے تو یہ جان کر مجھے خوش ہوتی ہے کیونکہ مردوں کا کوئی نہ کوئی پیشہ ہونا چاہیے اور لندن میں تو پہلے ہی بہت بے روزگار



ملکہ غزل

جب سے ہمیں یہ پتہ چلا ہے کہ ملکہ ترنم نور جہاں نے باقاعدہ شاعری شروع کر دی ہے۔ ان کی غزلوں کی کتاب عنقریب چھپ کر ”بازار“ میں آ رہی ہے، تب سے ہم سوچ رہے ہیں کہ یہ اطلاع ہے یا دھمکی۔ ملکہ ترنم ہمیں تب سے پسند ہیں جب ہم انہی اردو کی پہلی کتاب پڑھ رہے تھے۔ ان دنوں والد محترم ہمیں لاہور لائے اور مقبرہ جہانگیر کی سیر کروائی۔ واپسی پر وہ ہمیں مقبرہ نور جہاں لے گئے تو ہم زار و قطار رونے لگے۔ والد صاحب نے پوچھا

مثال ایسے ہی ہے جیسے ایک آدمی کا ایک بچہ جلتے ہوئے چولہے میں اور دوسرا بچہ فریج میں رکھ دیا جائے تو اس پر ماہر شریات یہ بتائے کہ اوسط کے اعتبار سے یہ شخص انتہائی پرسکون ہے۔ سو اوسط کے لحاظ سے تو ہر پاکستانی پرسکون ہے۔ غصے اور بے روزگاری میں بندہ اپنی ازجی اپنے ہی خلاف استعمال کرتا ہے۔ بے روزگاری میں جتلا مرلیٹوں کے علاج کے لیے ابھی تک کوئی موثر دوا مارکیٹ میں نہیں آئی۔ ہم سمجھتے ہیں بے روزگاروں کا علاج اب حکومت کے پاس نہیں، ڈاکٹروں کے پاس ہی ہے۔ ویسے یہ بھی ممکن ہے حکومت بے روزگاری میں دن بدن اضافہ ڈاکٹروں کو روزگار مہیا کرنے کے لیے ہی کر رہی ہو۔

ناعت سے وابستہ تھے ایک بار کسی خاتون کے ساتھ سینما دیکھنے گئے۔ رپورٹ پر ہائی کمان نے سامنے پیش ہوئی تو انہوں نے کہا: ”میری عزیزہ دوسرے شہر سے آئی تھی، فلم دکھانے لے گیا۔“ یہ سن کر کہا گیا: ”یہ تو ٹھیک ہے مگر جماعت کا نظم بھی کوئی چیز ہے۔“ اس پر وہ صاحب بولے: ”نظم اپنی جگہ پر غزل بھی آخر کوئی چیز ہے۔“

خواجہ پرویز نے میڈم کی شاعری کی اصلاح کی ہے، جس سے خواجہ صاحب کی شاعری مزید رومانی ہو گئی ہے۔ صاحب مرد کو شاعری کرنے کے لیے ایک عورت چاہیے اور خواتین کو شاعری کے لیے ایک بندہ۔ راسخ خواتین کے محل بناتے ہیں۔ قارئین ان میں رہتے ہیں اور پبلشرز ان کا کرایہ وصول کرتے ہیں۔ میڈم کی شاعری کی کتاب ہی نہیں وہ تو جس ادبی تقریب میں شرکت کریں گی اس کی تکئیں بکنے لگیں گی۔ یوں ادبی حلقوں میں رونق ہو جائے گی۔ ہم یہ تو نہیں کہتے، پہلے ادبی حلقوں میں الو بولتے ہیں کیونکہ ایک بار ہم نے کہہ دیا کہ لایوں کے نہ آنے کی وجہ سے حلقہ ارباب ذوق میں الو بول رہے تھے۔ تب سے کئی نقاد ہم سے ناراض ہیں۔ میڈم بڑی حساس خاتون ہیں۔ جوانی میں تو وہ دراسی بات پر خاوند سے کئی دن ناراض رہیں جس پر منو صاحب نے کہا: ”واقعی یہ دن کوئی ناراض رہ سکتی ہیں۔“ بے وقوف کا دل اس کے منہ میں ہوتا ہے اور عقل مند کا منہ اس کے دل میں۔ میڈم بھی دل سے گاتی ہیں۔ اب وہ دل لگا کر شاعری کریں گی لیکن اس شاعری کی ہی شہرت اور عزت میں اضافہ ہوگا۔ میڈم کو اس کا اتنا ہی فائدہ ہوگا جتنا اس نوجوان کو ہوا تھا جس نے یونین کے نمائندے کو چننے کی رقم دی اور ایک مقامی کلب کا شریک رکن جن لیا گیا تو اس نے پوچھا: ”اب جب کہ میں رکن بن گیا ہوں، مجھے کیا حقوق حاصل ہوئے ہیں؟“ نمائندے نے کچھ دیر سوچ کر کہا: ”میرے خیال میں آپ کو آئندہ سال پھر چند دینے کا حق حاصل ہو گیا ہے۔“

”جہیں نور جہاں کی کیا بات پسند تھی؟“ ہم نے روتے ہوئے کہا: ”اس کے گانے۔“ پھر جب ہم بڑے ہوئے اور ہم نے ”اردو کی آخری کتاب“ پڑھی تو ہمیں پچاس سے چل ایک ملکہ غیر ترن نور جہاں ہوا کرتی تھیں۔ بقول ابن انشاء ”جن لوگوں نے سرباب مودی کی فلم ”پکار“ دیکھی ہے اس کے لیے جگہ گیری ذات اور کارنامے محتاج تعارف نہ ہوں گے۔ اس کی بیوی نور جہاں تھی جو ملکہ ترن تو نہ تھی لیکن بعض اور کمالات رکھتی تھی۔ ابھی نو عمری تھی اور لوگوں کے کبوتر پکار کر اڑا دیا کرتی تھی۔ خصوصاً شہزادوں کے۔ بعد میں ایسی زوردار ملکہ ثابت ہوئی کہ بڑے بڑوں کے ہاتھوں کے طوطے اسے دیکھتے ہی اڑ جایا کرتے تھے۔“ جب سے ہمیں پتہ چلا کہ فلم انڈسٹری کی ملکہ نور جہاں نے شاعری شروع کر دی ہے، طوطے تو ہمارے ہاتھوں کے بھی اڑ گئے ہیں۔ شاعری اور گلوکاری کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جس میں چولی گلوکارہ کی اور دامن شاعری کا ہوتا ہے۔ شاعر دامن میں بیٹر شرکاء کو سن کر لگتا ہے انہیں گلوکار ہونا چاہیے تھا۔ ہمارے ایک شاعر دوست کہتے ہیں ”شاعری کے لیے دیوارِ ریاض چاہیے۔ پچھلے پختے ملے اور کہنے لگے: ”میں نے مشہور شاعر بننے کے لیے گلوکاری شروع کی تھی مگر محلے والے اس قدر مضرب کرتے ہیں کہ صبح تین بجے ہی اٹھ کر میرا دروازہ دیواریں یہاں تک کی چھت بھی اس زور سے ٹکھناتے ہیں کہ میں صبح دیو ریاض کر رہا ہوتا ہوں، مجھے اس کی آواز سنائی نہیں دیتی۔“ جرم کہتے ہیں اب کہ وہ ناقد جو کچھ نہیں کہتے وہ اتنے خطرناک نہیں ہوتے جتنے وہ ناقد جو پڑھ نہیں سکتے ایسے ہی نقادوں کی رائے ہے کہ حبیب جانب، مظفر وارثی اور صبا اختر شاعر کم گوینے زیادہ تھے۔ سو گلوکاروں کے لیے شاعری میں بڑا سکوپ ہے۔ اور اگر وہ گلوکارہ ہو تو پھر کیا ہی کہنے۔ میڈم نور جہاں تو ایک زمانے میں دیکھنے میں خود غزل لکھیں۔ اگرچہ آج کل وہ دیوان لگنے لگی ہیں۔ شاعری کے حوالے سے میڈم کا نام پہلے ہی بہت ہے۔ ایک بار تو ایک صاحب نے فیض احمد فیض سے کہہ دیا تھا کہ وہ نور جہاں والی غزل سنائیں۔ غزل عورتوں سے باتیں کرنے کو کہتے ہیں، لیکن میڈم جس عمر کی ہیں اس عمر کی عورتوں سے باتیں کرنا نظم ہی ہو سکتا ہے۔ اس عمر میں تو دل لگانا بھی دل کی ورزش کرنے کے زمرے میں آتا ہے۔ پھر پتہ نہیں میڈم نظم کی طرف کیوں نہیں آئیں، جیسے عطاء الحق قاسمی لکھتے ہیں ان کے ایک شاعر دوست جو زمانہ طالب علمی میں ایک

خاندانوں کے لیے۔ شاید اسی لیے بھارتی پارلیمنٹ میں ایک کانگریسی رکن نے نجی حیثیت سے یہ مسودہ قانون ایوان میں پیش کیا ہے جس کے تحت گھر چلانے والی بیویوں کو چھ دن کی مشقت کے بعد ایک دن کی چھٹی کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ گھر چلانے والی عورتوں کی اس چھٹی کی تجویز کو گھر چلانے والی عورتوں نے بہت سراہا ہے۔ سچی بات ہے گھروں میں خواتین کو جتنا کام کرنا پڑتا ہے اس کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے عورت ہونا ضروری ہے جو فی الحال ہمارے لیے ممکن نہیں۔ تاہم اتنا علم ہے کہ گھر میں ایک عام عورت صبح سے لے کر شام تک برتن دھونے والی 'دھوبن' بعد ارنی 'باورجن' استری کرنے والی 'ٹیلیفون اینڈینٹ 'نرس' ملازمہ' پرنسپل سیکرٹری 'دایہ' جوتے پالش کرنے والی اور نہ جانے کیا کیا ہوتی ہے۔ ایم اے کرنے کے بعد ایک شاعرہ کو نوکری نہ ملی تو اس نے شادی کر لی جس پر اس کی ایک سہیلی بولی:

"تمہیں اٹھ گھنٹوں کی ملازمت ہی کرنا چاہیے تھی۔"

دنیا میں دو قسم کے ملازم ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو سر اٹھا کر کلاک کی طرف دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں: "ابھی تین ہی بجے ہیں۔" اور دوسرے وہ جو اس حال میں کہتے ہیں "تین بج بھی گئے۔" ملازموں کی ایک تیسری قسم بھی ہے جسے خاتون کہتے ہیں۔ ایک ملازمت کے انٹرویو میں ایک خاتون سے پوچھا گیا: "آپ اپنی ذہنی صلاحیتوں کے بارے میں کچھ بتائیں گی؟" وہ محترمہ بولی: "میں اتنی ذہین اور سمجھ دار ہوں کہ پزل اور معضے حل کر کے اکثر انعام جیتی رہتی ہوں۔" انٹرویو کرنے والے نے کہا: "لیکن ہمیں تو وہ چاہیے جو اپنی ذہانت و دفتر میں دوران کام استعمال کر سکے۔" تو وہ بولی: "میں نے یہ معنی و فہم ہی میں تو حاصل کیے تھے۔" ساری خواتین ایسی بھی نہیں ہوتیں۔ ہم ایک ایسی خاتون کو جانتے ہیں جو ایک ہفتے میں دو ہفتوں کا کام کر لیتی ہے۔ اسی لیے اس کے پاس نے دو ہفتوں کی بجائے اسے ایک ہفتے کی چھٹی دی کہ تم اتنی تیز ہو کہ تم ایک ہفتے میں اتنا انجام دے سکتی ہو جتنا عام عورت دو ہفتوں میں کرتی ہے۔ اگرچہ بھارتی پارلیمنٹ میں پیش کیے گئے مسودے سے لگتا ہے 'چھٹی گھر میں ملازم ہے جسے ہفتہ وار چھٹی ملنا چاہیے۔ حالانکہ اگر یہ مطالبہ خاندانوں کی طرف سے ہو تاکہ انہیں گھر سے ہفتے میں ایک چھٹی ملنا چاہیے تو بات سمجھ میں آتی تھی، لیکن چونکہ مسودے میں چھٹی کا ذکر ہے اور چھٹی ہمیں اس قدر پسند ہے کہ ہمارے ہاں آدھے سال سے زیادہ سرکاری ملازمین کی



HOLYDAYS INN

کشور ناہید رخصت اور بشری رخصت کو دیکھ کر تو ہمارے ذہن میں یہی خیال آتا ہے کہ مردوں کو بھی عورتوں کے برابر حقوق ملنے چاہئیں۔ اگرچہ عورت ہونا ایک کیفیت ہے جو کبھی مرد پر بھی آسکتی ہے۔ سائنس کہتی ہے ماں کے پیٹ میں ہر بچہ پہلے لڑکی ہوتا ہے۔ یعنی قدرت جب کسی کو مرد بنانے میں ناکام ہوتی ہے تو اسے عورت ہی رہنے دیتی ہے۔ عورت ویسے بھی خدا نے دوسری Attempt میں بنائی۔ بیوی ہونا تو بڑا ہی مشکل ہے خاص کر کے

دونا چاہتی ہوں۔ اگر کنواری لڑکیوں کو بھرتی کرنے میں کوئی قباحت ہے تو شادی شدہ
نہ اتنیں کو تو موقع دینا چاہیے تاکہ ان کا تجربہ اور صلاحیتیں ملک و قوم کے کام آسکیں۔
ایسے ہمیں امید ہے کہ مرد خوش ہو کر خود ہی عورتوں کو ایک دن کی چھٹی دے دیں گے۔
اوسکتا ہے خاوند خوش ہو کر انہیں مزید چھٹی دینا چاہیں، لیکن سچی بات یہ ہے گھر تو گھر
افراد میں بھی عورتوں کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ مرد کا کام تو روٹ اور مشینیں
رکتی ہیں لیکن ابھی تک کوئی ایسی مشین ایجاد نہیں ہوئی جو روز آدھا ڈیہ لٹور استعمال
کرے 9 مرتبہ دواں روم جائے اور 16 پرسل کالز کرے۔

چھٹیاں ہوتی ہیں۔ 1996ء میں جمعہ ہفتہ کی 96، سرکاری 20، اتفاقیہ 25، استحقاقی 48 اور
اختیاری 21 چھٹیاں تھیں۔ اس حساب سے تو پاکستان Holidays Inn ہے۔ ہمارے ہاں
تو انصاف کی وجہ سے انگریزنگ گرمیوں میں پہاڑوں پر چلے جاتے ہیں۔ اب پتہ نہیں کیوں
گرمیوں میں انصاف پہاڑ پر چڑھ جاتا ہے۔ محکمہ تعلیم کا تو یہ حال ہے کہ ہمارے ایک رانٹر نے
بتایا کہ میں چار نوکریاں کرتا ہوں۔ صبح سے سہ پہر تک ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کام کرتا
ہوں۔ شام کو یوشن سنٹر اور رات کو ایک اخبار میں جاب ہے۔ عرض کیا: ”تو چھٹی جاب کے
لیے وقت کیسے نکالتے ہیں؟“ بولے: ”آپ کو پتہ تو ہے کہ میں کالج میں پروفیسر ہوں۔“ ہم
گھریلو خواتین کی بیٹے دار چھٹی کے حق میں تو ہیں، لیکن ہمیں یہ سمجھ نہیں آتی کہ بھارتی
پارلیمنٹ میں آخر یہ مسودہ ایک مرد نے کیوں پیش کیا۔ مرد تو شام کو گھر بلا وجہ پھول لائے تو
اس کی بھی کوئی وجہ ہوگی۔ خاوند اور سیاست دان جتنا کامیاب ہوتا ہے اتنا ہی وہ جھوٹا ہوتا ہے۔
سو اگر یہ مطالبہ کسی مرد کا ہے تو پھر اس میں فائدہ بھی مرد کا ہی ہوگا۔ ہم سمجھتے ہیں گھر کی
حکمران عورت ہوتی ہے۔ جہاں اکلوتا عوام خاوند ہے۔ خاتون سے یہ مطالبہ کہ وہ بیٹے میں ایک
دن چھٹی کیا کرے ایسے ہی ہے جیسے بے نظیر بھٹو صاحبہ سے کہتا کہ آپ بیٹے میں سات دن
وزیراعظم ہوتی ہیں، آپ پر بہت بوجھ ہے۔ آپ بیٹے میں ایک دن وزیراعظم کی جاب سے
چھٹی کر لیا کریں۔ اپوزیشن کو تو محترمہ کے آرام کا اس قدر خیال ہے کہ وہ تو کہتی ہے، محترمہ
بیٹے میں سات دن چھٹی کیا کریں۔ حالانکہ ہم سمجھتے ہیں موجودہ حکومت کے بڑے فائدے
ہیں۔ ہم نے ایک میاں بیوی سے پوچھا: ”لڑتے ہو تو الزام ایک دوسرے پر لگاتے ہو؟“
جواب ملا: ”نہیں۔ کبھی بچوں پر اور کبھی حکومت پر۔“

صاحب! زمانہ زنانہ لباس کی طرح بدل رہا ہے۔ پہلے چار یا چار سے زیادہ مرد اکٹھے
ہوتے تو وہ سیاست اور کھیلوں کے بارے میں باتیں کرتے اور جہاں چار یا چار سے زیادہ
عورتیں اکٹھی ہوتیں تو وہ مردوں کے بارے میں باتیں کرتیں۔ اب ہمارے ہاں عورتیں
کھیلوں اور سیاست کی باتیں کرتی ہیں اور مرد عورتوں کی۔ چھپے دنوں ایک محترمہ کا اخبار
میں خط چھپا۔ اس نے پاکستان کی محترمہ سے درخواست کی تھی کہ ہمارے ہاں فوج میں
عورت کو صرف ڈاکٹریازس کے روپ میں جاب ملتی ہے جبکہ میں لڑاکا فورس میں بھرتی

دلیل ہے۔ ایک بار ایک پریس فوٹو گرافر نے ہمیں خالد کھرل صاحب کی تصویر دکھاتے ہوئے کہا: ”اس تصویر میں وہ بہت ہی خوبصورت لگ رہے ہیں۔“ ہم نے پوچھا: ”اس میں کیا خاص بات ہے۔“ فوٹو گرافر بولا: ”اس میں ان کا منہ بند ہے۔“ برطانیہ میں ایک تصویر کی مقابلہ ہوا تھا جس میں نایاب ترین لمحوں کی تصویریں تھیں۔ ان میں جس تصویر کو حوصلہ افزائی کا انعام ملا، وہ اس فوٹو گرافر کی ساس کی تھی اور تصویر میں ساس چپ بیٹھی تھی۔ دنیا میں ساسوں کے بعد سب سے زیادہ سیاست دان بولتے ہیں۔ لیکن لگتا ہے ہمارے بچے کم کرنے کی وزارت کے وزیر بے سالک صاحب بچوں کی طرح بولنے کو اہم کام سمجھتے ہیں۔ اسی لیے انہوں نے فرمایا ہے میں نے قذافی سنڈیم میں مسلسل 16 گھنٹے تقریر کر کے ورلڈ ریکارڈ قائم کیا ہے۔ اس لیے میرا ٹم گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں شامل ہونا چاہیے۔ ہمارے خیال میں تو اس میں سننے والوں کا نام شامل ہونا چاہیے۔ اتنے گھنٹے تو بندہ طاہرہ سید کو سنے تو قسیم بخاری لگنے لگتا ہے۔ ہاں اگر وہ کہتے کہ مسلسل 16 گھنٹے اس علاقے کے لوگوں کو تقریر میں مصروف رکھ کر میں نے بہبود آبادی کا یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے کہ اس علاقے میں بچوں کی شرح پیدائش ایک فیصد کم کر دی ہے تو بات ماننے والی تھی۔

ہم بے سالک صاحب کو ذاتی طور پر نہیں جانتے، لیکن ہم نے نور جہاں عطاء اللہ عیسیٰ ’جیلوی‘ بے نظیر، ریشماں، حسین بخش گلو، نواز شریف اور بے سالک کو بہت سنا ہے۔ بے سالک پہلے ہاتھ چموز کر سائیکل چلایا کرتے تھے۔ آج کل ایسے ہی وزارت چلاتے ہیں۔ ہماری جس بارے میں اچھی رائے ہو، اسے ذاتی طور پر جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ جب گیمبیا آزاد ہوا تو اس کے وزیر اعظم پیشے کے اعتبار سے جانوروں کے ڈاکٹر تھے۔ بی بی سی کے نمائندے نے انٹر ویو لیتے ہوئے ان سے پوچھا: ”آپ کا پیشہ“ تو وہ بولے: ”میرے ملک کی کسی گائے سے پوچھ لو۔ وہ مجھے ذاتی طور پر جانتی ہے۔“ ہم ذہنی امراض کے ڈاکٹر ہیں۔ سیاست دانوں سے اس لیے نہیں ملتے کہ لوگ سمجھتے ہیں، ہمارا ان سے پیشہ وارانہ تعلق ہے۔ یہ تعلق بڑا مشکوک ہوتا ہے۔ ہمارے ایک ڈاکٹر صاحب کی فلمی ڈانسر سے ملاقاتوں کی خبر اس کی بیوی تک پہنچی تو اس نے پوچھا: ”تم اس



و۔ زیر بیان

اشارہ پڑھ کر ہمیں تو لگتا ہے ہر وزیر بیرون وزیر بیان ہے۔ ایک سیاست دان کی سانس اکھڑ رہی تھی۔ آکسیجن لگانے سے بھی بہتر نہ ہوئی تو اس کا پی اے ایک صحافی کو پکڑ لایا۔ سیاست دان موصوف نے بیان دیا تو ان کی سانس میں سانس آئی۔ ان کے بیان روکنے سے وہی نتیجہ نکلتا ہے جو سانس روکنے سے اور ہماری حوصلہ سے خواہش ہے کہ ان کو خاموش دیکھیں۔ پہلے خاموشی عقل مند کی دلیل ہوتی تھی اب خاموشی عقل مند کی

والدین۔ ہالی وڈ میں اس بچے کو کتر خیال کیا جاتا ہے جو جب گراٹر سکول سے گریجویشن کر کے نکلے تو اس کے والدین وہی ہوں جنہوں نے اسے کنڈرگارٹن میں داخل کر دیا تھا۔ سالک صاحب کا حکمہ تو ناامیدی پھیلانے کے لیے ہے کیونکہ اس کا مقصد ہے کوئی امید سے نہ ہو۔ اس کے باوجود ہمیں بے سالک صاحب سے بڑی امید ہے۔ جہاں تک ورلڈ ریکارڈ بنانے کا تعلق ہے تو انہیں چاہیے 16 گھنٹے خاموش رہنے کا ریکارڈ بنائیں کیونکہ سولہ گھنٹے کی مسلسل تقریر کا کوئی نوٹس نہ لے گا۔ اگر کسی نے نوٹس لیا ہوتا تو یہ سولہ گھنٹے کی ہوتی ہی کیوں۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

حرفہ کو کس سلسلے میں ملتے ہو؟“ ڈاکٹر نے کہا: ”پیشے کے سلسلے سے۔“ تو یہی بولی: ”کس کا پیشہ تمہارا یا اس کا۔“ کچھل چند دھانیوں اور دوپائیوں میں سیاست دانوں نے بڑی ترقی کی ہے۔ ایک سیاست دان کو ہم بھی جانتے ہیں، جنہوں نے میٹرک بھی کر لیا ہے۔ وہ ایک تقریر میں فرار ہے تھے: ”انسان اور جانور میں بڑا فرق ہے۔ انسان نے پچھلے دس برسوں میں بڑی ترقی کی ہے، جبکہ جانوروں نے نہیں کی۔“ ایک صحافی نے پوچھا: ”آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟“ تو وہ بولے: ”مگر مدد کو دیکھ لیں۔ جیسا پہلا تھا ویسا ہی آج آپ کے سامنے ہے۔“

زبان میں سب کچھ ہو سکتا ہے، لیکن ہڈی نہیں۔ سیاست دان زبان سے سوچتا ہے۔ اس کا منہ اس کے دماغ سے تیز چلتا ہے۔ کہتے ہیں برصغیر پر انگریز نے اتنے سال اپنی زبان کے زور پر حکومت کی۔ تاریخ گواہ ہے، وہی قوم دوسری پر حاوی ہوئی جس کی زبان دوسری قوم کی زبان پر حاوی ہو گئی۔ سیاست دان ہم پر زبان کے زور پر حکومت کرتے ہیں۔ وہ سولہ سولہ گھنٹے بولتے ہیں اور ایک بات بھی نہیں کہتے۔ اسٹیج میں ان کی گفتگو کو خود کلامی کہتے ہیں۔ وہ مفت بولتے ہیں مگر چپ ہونے کے پیچھے لیتے ہیں۔ ان کی یادداشت اتنی کمزور ہوتی ہے کہ ایک سیاست دان نے کہا: ”مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ بچپن میں جب میں اپنے چار منزلہ مکان کی چھت سے گرا تھا، تو زندہ بھی بچا تھا یا نہیں۔ ایران میں اطلاعات و نشریات کے وزیر کو وزیر ارشاد کہتے ہیں۔ یہاں تو ہر وزیر، وزیر ارشاد ہے۔ جتنے ان کے منہ سے روزانہ الفاظ نکلتے ہیں، اتنے گندم کے دانے نکلتے تو پاکستان میں کوئی بھوکا نہ سوتا۔

بے سالک صاحب کہتے ہیں: ”کام کرنے کے تین طریقے ہیں۔ ایک صحیح طریقہ۔ دوسرا غلط طریقہ اور تیسرا امیر طریقہ۔“ وہ بڑے طریقے سے ریکارڈ بناتے رہتے ہیں۔ وہ نیچے کنٹرول کرنا چاہتے ہیں حالانکہ وہ بیڑوں کو کنٹرول کر لیں تو بچے ہوں ہی نا۔ حکمہ یہود آبادی اب حکمہ بے بہا بود آبادی بن گیا ہے۔ حکمہ یہود آبادی کا ایک افسر بتا رہا تھا: ”وہ مصری جنہوں نے احتیاطی تدابیر نہ کیں، ”حمی“ بن گئے۔“ ہمارے ہاں یہ کچھ کرنے والے ڈیڈی بننے ہیں۔ ہمارے ہاں بچے بہت ہوتے ہیں اور مغرب والے

سب سے پہلے یہی احساس ہوتا ہے کہ اس ملک میں خواتین کم ہی رہتی ہیں۔ آج کے اخبارات میں چھپنے والے اعداد و شمار نے اس غمگین خیال میں بدل دیا ہے۔ کہتے ہیں جھوٹ و دو قسم کے ہوتے ہیں ایک سفید جھوٹ اور دوسرے اعداد و شمار۔ بجٹ کے بعد سے ہم اعداد و شمار سے یوں ڈرتے ہیں جیسے سانپ کا ڈساری ہے۔ آج کے اخباری اعداد و شمار نے ہمارے علاوہ مولویانہ حلقوں میں بھی تشویش کی لہر دوڑا دی ہے۔ جس کے مطابق پاکستان میں عورتوں کی تعداد اس قدر کم ہو گئی ہے کہ ہر دس مردوں میں سے ایک عورت نہ ملنے کی وجہ سے کٹوا رہا جائے گا۔ جس پر ایک مولوی صاحب نے پریشان ہوتے ہوئے کہا: ”گو یا اب ایک ہی شادی پر شاد ہونا پڑے گا یا پھر مولانا فضل الرحمن کی طرح اس نیک کام کے لیے کسی اور ملک سے رجوع کرنا پڑے گا۔“

پاکستان میں تو آبادی کی گنتی کرنا مردم شماری کہلاتا ہے۔ سو ہمیں اس حواشاری سے خوشی ہوئی کہ عورتیں بھی کسی گنتی میں آئیں۔ کچھ ملکوں میں ابھی بھی عورتوں کو گنا نہیں توڑا جاتا ہے۔ نا بھجریا کے کچھ علاقے میں شادی سے پہلے عورت کا وزن کر کے دیکھتے ہیں۔ جس کا وزن جتنا زیادہ ہو، اسے بیوی بنانے کیلئے اتنے زیادہ پیسے دینے پڑتے ہیں، جس کی وجہ ہمارے دانشور دوست یہ بتاتے ہیں کہ نا بھجریا غیر ترقی یافتہ ملک ہے۔ شاید ہماری حکومت نے پاکستان کو ترقی یافتہ بنانے کے لیے ہی عورتوں کو گنا شروع کیا ہو۔ ممتاز افسانہ نگار انتظار حسین لکھتے ہیں گنتی انسان کی سب سے بڑی ایجاد ہے۔ انسان اس دن مہذب ہوا جس روز اس نے گنتی سیکھی۔ شاید اسی لیے بچے کو سب سے پہلے گنتی سکھاتے ہیں۔ گنتی کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ ہمارے صوبائی وزیر تعلیم کے میٹرک میں نمبر کم آئے تو اس نے کہا: ”گنتی دوبارہ کراؤ۔ دھاندلی ہوئی ہے۔“ ہو سکتا ہے عورتیں کہیں کہ ہم اتنی بھی کم نہیں ہیں۔ ہمارے ساتھ بھی دھاندلی ہوئی ہے۔ حواشاری دوبارہ ہونی چاہیے۔ موجودہ حکومت نے عورتوں کی گنتی بڑھانے کے لیے بیٹنگی اقدامات کے طور پر ان کے ووٹ دکر دینے ہیں۔ ویسے تو ہمارے ہاں ایک بیوی کو بھی دو ہی سمجھا جاتا ہے۔ سابق گورنر میاں اطہر صاحب سے ایک بار ہم نے پوچھا: ”بندہ سب سے بہادر کہاں ہوتا ہے؟ گھر سے باہر یا گھر میں؟“ تو وہ بولے: ”گھر میں“ خاص کر کے اس وقت جب گھر والی باہر ہو۔“ شادی سے پہلے



حواشاری

کسی مغربی ملک کے ایئر پورٹ پر اترتے ہی بندے کو لگتا ہے جیسے یہاں کے تمام مرد بڑا تال پر ہیں۔ اردو کے سفر نامہ نگاروں کے سفر نامے پڑھ کر تو لگتا ہے کہ وہاں کے شہر بھی مردوں سے خالی ہی ہوتے ہیں۔ اسی لیے ہر طرف عورتیں ہی عورتیں نظر آتی ہیں۔ ہم نے تاشقند ایئر پورٹ پر ایک محترمہ سے پوچھا تھا: ”آپ کے مرد کہاں ملتے ہیں؟“ تو وہ بولی: ”واڈاکا کی خالی بوتل کے پاس۔“ اس کے برعکس پاکستان کے کسی ایئر پورٹ پر اترتے ہوئے



۱۔ دبی حکومت

ہماری ایک مشہور اداکارہ نے شادی سے اگلے روز ہی کہہ دیا تھا کہ خاندان حکومت طرح ہوتے ہیں۔ یہ وعدے بہت کرتے ہیں مگر کچھ کر کے نہیں دکھاتے۔ لیکن ہمیں حکومت سے کوئی شکایت نہیں۔ اگرچہ آج کل جو حکومت سے شکایت نہیں کرتا لوگ بچتے ہیں یہ حکومت کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ ویسے بھی ہمارا حکومت سے اپنے ایک جاننے والے کی طرح کا معاہدہ ہے۔ موصوف کے پاس ایک شخص ادھار لینے آیا تو بولے: ”میرا

بیوی کی آنکھیں کبھی ہرٹی جیسی لگتی ہیں تو کبھی پھلی کی طرح، لیکن شادی کے بعد یہ طوطے جیسی لگنے لگتی ہیں۔ شادی کے بعد وہ کان سے کم اور آنکھ سے زیادہ سختی ہے۔ عربوں میں غریب اسے کہتے ہیں جس کے پاس ایک ہی بیوی ہو۔ پر مغرب میں پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کرنے پر سزا ملتی ہے۔ ہمارے ہاں بھی دوسری شادی پر سزا ہے اور وہ ہے دوسری ساس۔ بیوی تو ایک بھی بہت ہوتی ہے پر کیا کریں ایک سے کم بیوی ہو نہیں سکتی۔ کہتے ہیں دودھ کا جلا چھانچہ بھی پھوک پھوک کر پیتا ہے۔ ہمارے ایک شاعر دوست اپنی بیوی کی قبر پر دبے پاؤں جاتے ہیں کہ کہیں سکھلے سے وہ اٹھ نہ پڑے۔ اسی لیے انہوں نے بیوی کی قبر پہلی فرصت میں ہی پکی کرادی تھی کہ کہتے ہیں قبر پکی کرنا اس دن شروع ہوا جس روز ایک بندے کی بیوی قبر سے نکل کر زندہ ہو گئی۔ ہمارے ہاں کچھ لوگ بیوی کو پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں۔ شاید اسی لیے ساتھ لے کر مسجد نہیں جاتے۔ خاندان چھانچہ ہو تو بیوی کے پاس خوش رہنے کے سوجیلے ہیں۔ اکیلی بیٹی ان بندوں کی فہرست بنائے جن سے اس کی شادی ہو سکتی تھی۔ اور پھر اس پر خوش ہو کہ نہیں ہوئی۔ اسی لیے ٹولاس اینجلس کی رنگ و روغن کی دکان پر یہ بورڈ لگانا پڑتا ہے کہ جو خاندان خود رنگ پسند کرنا چاہتے ہیں ان کے پاس ان کی بیوی کی تحریر کی اجازت نامہ ہونا ضروری ہے۔ جنوبی مراکو کی عورتیں اس لیے پاؤں سے کپڑے دھوتی ہیں کہ ہاتھوں سے دھونے کے لیے جھٹکانا پڑتا ہے۔ اور وہاں بیوی جھک جائے تو لوگ اسے خاندان کہنے لگتے ہیں۔ پاکستان ان ممالک میں سے ہے جہاں گھر سے لے کر حکومت تک عورتوں کی حکمرانی ہے۔ یہاں خواتین کم ہیں تو کیا ہو۔ خاتون ایک بھی ہو تو وہ کئی مردوں سے زیادہ نظر آتی ہے۔ معاشرے میں خواتین شاید اس لیے کم رہ گئی ہیں کہ زیادہ حکومت میں جو آگئی ہیں۔

اس کی جیب خالی اور ایش ٹرے بھری ہوئی ہوتی۔ غالب اور فیض جیسے شاعروں کے قیمتی شعر سستے کاغذ پر چند روپوں میں بازار سے مل جاتے۔ ہر ایر غیر معمولی رقم سے علامہ اقبال کا کل کلام خرید لیتا۔ گزشتہ مکتوب میں میر، غالب، اقبال اور فیض کی تخلیقات کو اپنا قیمتی سرمایہ کہتی رہیں، لیکن صحیح معنوں میں اسے ”قیمتی سرمایہ“ موجودہ حکومت نے بنایا۔ اس ادبی حکومت کے ان اقدامات سے آج کے شاعروں کو جو فائدہ ہوگا، اس کا وہ سوچ بھی نہیں کتے۔ ہمارے بہت سے شاعر صرف اس لیے بڑے شاعر بن سکے کہ ان کا مجموعہ کلام چھپ گیا۔ اپنی کتاب چھپوانا دراصل دوسروں کو اپنے خلاف مواد مہیا کرنا ہے۔ ویسے بھی غیر مطبوعہ کلام بندے کی طرح ہوتا ہے۔ دوست اسے ایک نظر دیکھتے ہیں اور تعریف کرتے ہیں۔ جب وہ چھپ جاتا ہے تو پھر طوائف کی طرح اسے کوئی بھی خرید سکتا ہے۔ پبلشر تو رانگز بچتا ہے۔ بھلے وقتوں میں حکومت انہیں خرید لیتی تھی۔ اب ضرورت نہیں رہی کیونکہ ایک شاعر سے تو ایک بدکا ہوگا اور حکمران کو زیادہ نقصان پہنچا سکتا ہے۔

کتابیں اور کاغذ بھگا ہونے سے شاعر اپنا کلام نہ چھوڑ سکتا ہے اور باعزت زندگی گزاریں گے۔ ہمارے ایک فلمی شاعر کے بقول غلطیوں کے علاوہ ہماری شاعری میں کوئی چیز اور بچل نہیں۔ اگرچہ کاغذ بڑی صابر شے ہے۔ سچ بھی سہ جاتا ہے، پھر بھی فی زمانہ کسی بھی کتاب کا سب سے قیمتی صفحہ اس کا خالی صفحہ ہی ہے۔ ہمیں تو شاعری کی کتاب پڑھنے کی بجائے بقول جون ایلیا شاعروں کا ”کھانا“ سننے، مشاعروں میں جانا پسند ہے۔ ہمارے پسندیدہ شاعر مظفر وارثی ہیں جس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم نے ان کی کوئی کتاب نہیں پڑھی اور دوسری یہ کہ ان کا ترنم بہت اچھا ہے۔ احمد فراز کی آواز بھی ہمیں پسند ہے، لیکن ان کی دو سے زیادہ غزلیں ایک وقت میں سن میں تو ہمارے نکل آتے ہیں۔ مشاعروں کے اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔ زخمی کان پوری کی بیوی نے ایک بار کہا: ”سب سے کہہ رہی ہوں، غماز لا دو۔“ بولے: ”ہنگم ٹھوڑی دیر اور صبر کر لو۔ شام کو مجھے مشاعرے پر تو جانا ہی ہے۔“ البتہ کچھ شاعر مشاعروں میں لکھا ہوا پڑھتے ہیں۔ ہم نے ایک شاعر سے اس کی وجہ پوچھی تو بولے: ”لوگ کہنے لگے تھے، مجھے لکھنا نہیں

مچھلی پکڑوں گا کام بینک کے ساتھ معاہدے کی وجہ سے چل رہا ہے۔“ پوچھا: ”کیسا معاہدہ؟“ یہ کہ بینک میرے والا کام نہیں کرے گا اور میں بینک والا کام نہیں کروں گا۔“ ایسے ہی ہم حکومت کا کام نہیں کرتے، حکومت ہمارا کام نہیں کرتی۔ وزیر اعظم نواز شریف بنے یا بے نظیر، ہم تو اسی پر خوش ہو جاتے ہیں کہ چلو ایک وقت میں ان میں سے صرف ایک ہی وزیر اعظم ہے۔ ہم مانتے ہیں طاقت کا منبع عوام ہے مگر طاقت ان کی طرف لوٹ کر رہی آتی۔ وہ عوام جن کا ناس مار دیا جائے، اسے عوام الناس کہتے ہیں۔ عوام الناس نے پاکستان کو بڑ تالیوں کا ملک بنادیا ہے۔ ہفتے میں پانچ دن ہڑتال اور باقی دو دن چھٹی ہوتی ہے۔ البتہ حکومت کی چھٹی نہیں ہوتی۔ یہی حالات رہے تو ایک دن وزارت ہڑتال بنانا پڑے گی۔ وزیر ہڑتال کا کام بھی وزیر بھہو آبادی جیسا ہوگا۔ یعنی ایک بچے کنٹرول کرے گا اور دوسرا بولے۔ ہم مانتے ہیں حق کی ہمیشہ فتح ہوتی ہے۔ کیونکہ جس کی بھی فتح ہوتی ہے وہ ہمیشہ حق پر ہی ہوتا ہے، لیکن کبھی کبھی ہڑتال کی وجہ ایسی ہوتی ہے کہ اس پر احتجاجاً ہڑتال کرنے کو دل چاہتا ہے۔ جیسے اردو بازار کے تاجروں کی ہڑتال اس لیے تھی کہ سبز ٹیکس گلے سے کتابوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں گی۔ اس سے پہلے تاجر اور پبلشر آسمان سے باتیں کرتے تھے۔ پبلشر میں تو پورا ”شر“ آتا ہے۔ تمہاں سیکشن نے ایک بار کہا تھا: ”حضرات! میں مانتا ہوں، نیو لین بڑا سنگ دل اور خال خال شخص تھا۔ اس نے میری برادری پر بڑے ظلم کیے، لیکن یہ مہربان بولیں کہ اس نے ایک پبلشر کو گولی بھی ماری تھی۔“ جی بات ہے ہمیں تو یہ سن کر خوشی ہوئی کہ حکومت نے علم و ادب کی قدردانی کی۔ ”قیمت“ میں اضافہ کیا ہے۔ علم و ادب جتنا قیمتی ہے نظیر حکومت میں ہوا کسی حکومت میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ حکومت نے مہنگائی کی تو بہت کچھ سستا بھی کیا۔ جیسے رہنے والے وہ پیر سستا کر دیتی ہے تاکہ عوام یہ نہ سمجھیں کہ ہر چیز مہنگی ہی ہو رہی ہے۔ جب ہمیں پتہ چلا تھا کہ ہمارے مقامی سیاست دان تین تین کروڑ کے ہو گئے ہیں، تب سے ہماری خواہش تھی کہ ہمارے صحافی اور ادیب بھی قیمتی ہونے چاہئیں۔ سو حکومت نے کچھ صحافیوں میں بھی اضافہ کیا۔ موجودہ جھٹ میں علم و ادب کو قیمتی بنانے کا اہتمام ہے، اس سے پہلے تو ادیب شاعر کی یہ نشانی تھی کہ

آتا۔“ دیکھا آپ نے الفاظ کس طرح زخمی کرتے ہیں، خصوصاً اس وقت جب آپ کی بیوی آپ پر ڈکٹری دے مارے۔

اس ادبی حکومت نے ادب ادیب سے مہنگا کر دیا۔ روس میں تو آج کل کوئی غریب آدمی ادب لکھ ہی نہیں سکتا۔ کاغذ اتنا مہنگا ہو گیا ہے کہ ادیب کو اپنا لفظ ایک روپے میں پڑتا ہے۔ شاید اسی لیے روسی ادب بڑا ”رج“ ہے۔ موجودہ بجٹ کے بعد ہمیں بھی لفظوں کی قیمت کا اندازہ ہونے لگا ہے۔ ایک ادیب کا خیال ہے کاغذ مہنگا ہونے سے ادیب شاعر رف لکھا ہوا اس ڈر سے ”نیٹ“ نہیں کریں گے کہ ذیل خرچہ ہوگا۔ سو وہ اسے ہی چھو ادیں گے۔ ویسے پچھلے چند سالوں میں جو کتابیں چھپیں ہیں انہیں پڑھ کر تو لگتا ہے ہمارے رائٹر بڑے مستقبل شناس ہیں جنہوں نے برسوں پہلے ہی یہ شروع کر دیا تھا۔



و - ردی

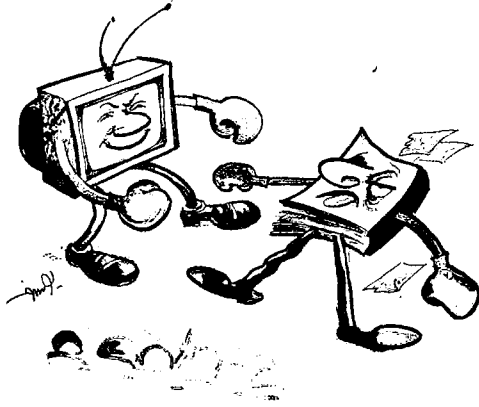
وردی چاہے وہ ردی ہی کیوں نہ ہو، پھر بھی اس کا اتنا احترام ہے کہ اسرائیلی پولیس میں شامل خواتین کو ہدایت کی گئی تھی کہ جب بھی تم کوئی غیر اخلاقی حرکت کرنے لگو تو پہلے سرکاری وردی اتار دو۔ وردی کی افادیت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ امریکہ کی ایک ریاست میں پولیس افسر کو شیر کھا گیا۔ اس سانحہ کی وجوہات جاننے کے لیے کمیٹی بٹھائی گئی جس نے حادثے کی وجہ یہ بتائی کہ افسر نے اس وقت وردی نہیں پہنی تھی۔ ہر ملک میں پولیس کی

وردی ایسی ہے جیسی ہمارے ہاں باجا بنانے والوں کی ہوتی ہے۔ ویسے انہیں جو مل جائے اس کا باجا بھی دیتے ہیں۔ البتہ ان کی زنانہ پولیس کی وردی دیکھ کر ہم نے گھڑ سے پوچھا: ”پینٹ سکس ٹائٹ ہے؟“ بولا: ”یہ سکس سے بھی ٹائٹ ہے۔“ پوچھا: ”آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟“ بولا: ”انہی سکس میں یہ مختصر نیچے بیٹھ سکتی ہے مگر اس پینٹ میں نہیں۔“ مگر جب ہندوستان کے حاکم تھے تو انہوں نے یہاں کی پولیس کو ٹیکریں پہنادی تھیں جس کا بڑا فائدہ ہوا۔ پولیس کی وردی پر کم کپڑا لگنے لگا۔ ہمارے وزیر داخلہ کی نظر بھی آج کل زنانہ پولیس کو لباس پر ہے۔ انہوں نے فرمایا ہے زنانہ پولیس کو شلوار کی بجائے چٹون پہنانی جائے گی کیونکہ شلوار قمیص میں وہ جس کو نہیں رہیں۔ ویسے یہ سچ ہے، خاتون نے پینٹ پہنی ہو تو اسے بڑا چوکس رہنا پڑتا ہے۔ مزید کہا گیا ہے کہ شلوار میں زنانہ پولیس کو بھاگنے میں بھی مشکل ہوتی ہے۔ صاحب! ہم تو عورتوں کو بھاگنے کے خلاف ہیں، چاہے وہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کی ہی کیوں نہ ہوں۔ پھر پولیس ایسی ہونی چاہیے جو بھاگتی نہ ہو۔ وزیر داخلہ نے زنانہ پولیس کی ساری تا کر دی بر شلوار ڈال دی ہے۔ شلوار تو وزیر داخلہ کی طرح ڈھیلا ڈھالا لباس ہے۔ آج تک پتہ نہیں چل سکا کہ شلوار واحد ہے یا جمع۔ کیونکہ یہ اوپر سے واحد اور نیچے سے جمع ہوتی ہے۔ البتہ باہر کے ملکوں میں ایسا لباس پہننے دیکھ کر لوگ آپ کی عبادت کر نہ لگتے ہیں۔ چٹون کے استعمال سے ہماری مردانہ پولیس تو پہلے ہی اتنی تیز ہو گئی ہے کہ آپ کسی مجرم کی تلاش میں اس کے گھر پہنچیں تو اندر پولیس والا پہلے ہی موجود ہوگا۔ پولیس ایسا ڈیپارٹمنٹ ہے کہ ہم تنبیہ کی سے اس کی تعریف بھی کریں تو سننے والے ہنسنے لگتے ہیں۔ البتہ اس کے بارے میں کوئی مزاحیہ بات کر دیں تو سب سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ ہمارا ایک دوست دن رات گلیوں میں پھر تار بٹاتا ہے، پھر اسے سوچا جیئے اس کا معاوضہ بھی ملنا چاہیے اور وہ پولیس میں بھرتی ہو گیا۔ ایک دن ہم نے اسے بتایا کہ لوگ فیض احمد فیض صاحب کی اتنی عزت کرتے کہ ایک بار انہوں نے ریزمیں والے سے پھل لیا تو اس نے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ جس پر وہ بولا: ”فیض جتنی عزت تو معاشرے میں ہماری بھی ہے۔“ یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک نقاد نے رائے کی کہ ماہد صدیقی اس دور کا غالب ہے۔ یاد رہے موصوف اس نقاد کے مقروض بھی ہیں۔ اب ایسا زمانہ آگیا ہے کہ جس شخص کو سزاوار نہ ہوتے ہوئے سزا دی جائے

تو اس کا زخم دار وہ خود ہے۔ اسے کوئی قابل سزا کم کرنا چاہیے۔ پہلے پولیس کا کام عوام کو چوروں ڈاکوؤں سے بچانا ہوتا تھا اب پولیس کا کام الٹ ہو گیا ہے۔ اب اس کا کام عوام سے وزیروں، مشیروں کو بچانا ہے۔ اس کے باوجود عوام سے پولیس کا بڑا مضبوط تعلق ہے۔ جی ہاں! بلریرہ جھکڑی۔ اب تو ہر علاقے میں تھانہ بنادیا گیا ہے تاکہ جرائم پیشہ افراد کو دور نہ بنانا پڑے۔ گزشتہ تیس سالوں کے دوران امریکہ میں جرائم کی تعداد دو گنی گئی ہو گئی ہے۔ شکر ہے ہمارے ہاں یہ صلاحیتیں نہیں، ورنہ ہمارے ہاں جرائم کی ”گناہ“ بڑھ جاتے۔

زنانہ پولیس کے چٹون پہننے پر سب سے زیادہ پریشان پشتو فلموں کے ہدایت کار ہیں کہ اب ان کی فلمیں کون دیکھے گا۔ اب تو اردو پنجابی فلموں کو ہٹ کرنے کے لیے بھی زنانہ پولیس کو چٹون پہنادی جاتی ہے، جو اکثر اتنی فٹ ہوتی ہے کہ دیکھنے والے کو فٹ پڑنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ لگتا ہے انہی زنانہ چٹونوں کی کارکردگی سے متاثر ہو کر ایسا سوچا گیا ہے کہ فلموں میں چٹون سے ناظرین کا قبو کیے جاسکتے ہیں تو مجرم کیوں نہیں کیے جاسکتے۔ ہو سکتا ہے، وفاقی وزیر فلمی پولیس کو بھی اپنے اثر سمجھتے ہوں، جسے غلام دھبگیر خان جب لیبر فنانسر بنے تو وہ سمجھتے تھے لیبر ورکر بھی ان کے ماتحت ہیں۔

ہمیں ڈر ہے کہ زنانہ پولیس کا یہ لباس بھی سنری زد میں نہ آجائے۔ کچھ لوگ عریانی اور فاشی کی تلاش میں سنر بورڈ میں آ جاتے ہیں۔ پچھلے دنوں پشتو فلموں کے سنر بورڈ کے رکن نے استعفیٰ دے دیا کیونکہ ڈاکو نے اسے کہا تھا کہ اگر ہر دس سینکڑے کے بعد آنکھیں نہ جھپکاو گے تو اندھے ہو جاؤ گے۔ ایک ملکیت نے ہمیں بتایا کہ جب سے مجھے دے کا مرض شروع ہوا ہے، میں پشتو فلم دیکھنے جانے لگا ہوں تاکہ میرے گھر سے سانس ضائع نہ ہوں۔ اب اسے سینما جانے کی ضرورت نہ پڑے گی۔ صاحب! کل مارکس کتاورد اندر لیش تھا اس نے بلیو فلموں کے آغاز سے ساٹھ سال پہلے ہی کہہ دیا تھا: ”دنیا کے محنت کشوں کو ایک ہو جاؤ۔“ 1975ء میں ہمارے ہاں فاشی اور عریانی کے خلاف ایسی تحریک چلی کہ میڈیکل کی کتابیں بھی سنر ہونے لگیں۔ ہم گائی کی کتاب لینے جاتے جو سنر کے بعد آرتھو پیڈک کی گئیں۔ سرحد میں تو اس قدر پردہ ہے کہ وہاں تو بکریوں کو بھی ریز پر پہنا کر رکھتے ہیں۔ یہاں زنانہ پولیس چٹون پہن کر چل رہی ہوگی تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ پشتو فلم چل رہی



علم فی کلوگرام

گلف نیوز کے مطابق تھائی لینڈ کی وزارت تعلیم نے بستانوں کے غیر ضروری وزن سے نجات دلانے کے لیے کنڈرگارٹن کے طلبہ کے لیے ایک کلوگرام 'پرائمری دو کلوگرام اور ہائی سکول کے طلبہ کے لیے تین کلوگرام وزن رکھا ہے۔ اس حساب سے تو کالج کے طلبہ کا بستہ چار کلوگرام کا ہو گا۔ ہمارے ہاں تو جوں جوں کلاس بڑھتی ہے کتابیں گھٹتی ہیں۔ کالجوں میں تو صرف "کاپی" سے کام چلتا ہے۔ بستہ ہوتا بھی ہے تو وہ

ہے۔ زنانہ پولیس پہلے زنانہ ہے، پھر پولیس۔ ہمارے ایک دوست اپنی کانشیل بیوی کو قہانے چھوڑنے اور لے جانے جاتے ہیں۔ ہم نے وجہ پوچھی تو بولے: "زنانہ ایسا ہے۔" خیر اس زمانے میں تو بزدل ہونے کے لیے بھی بڑا حوصلہ چاہیے۔ ویسے کئی بہادر لیڈی کانشیل بھی ہیں۔ ایک ایسی محترمہ مجرم کے بارے میں کہہ رہی تھیں کہ میں نے اس کا تعاقب آخری سانس تک کرنا تھا مگر وہ بزدل بھاگا ہی نہیں۔ تا اطلاع "لاٹانی" زنانہ پولیس نے چٹو نہیں پہننے سے انکار کر دیا جس پر مجھڑوں کے ایک گرو نے کہا ہے: "ہمیں پولیس میں بھرتی کر لیں اور جودل چاہے پہنائیں۔ پہنانے پر ہمیں بھی کوئی اعتراض نہیں رہا۔ پھر ہماری درمیانہ پولیس بیک وقت زنانہ اور مردانہ تھانوں میں کام کر سکتی ہے۔ ہمارا ذہن بھی دوسروں سے دو گنا ہے۔ ہم ڈبل مائنڈ ڈ ہیں۔ ہم ملاوٹ کے بھی خلاف ہیں کیونکہ ہم خود ملاوٹ کے ستارے ہوئے ہیں۔ اتنے تیز ہیں کہ ڈاکے پر پولیس لیٹ ہو جاتی ہے ماکے پر ہم کبھی لیٹ نہیں ہوئے۔ ٹریفک کے دس سپانی مل کر بھی ہماری ایک جموری جیسی کار کردگی کا مظاہرہ نہیں کر سکتے، کیونکہ لوگ ٹریفک کے اشاروں پر نہیں رکتے۔ ہمارے اشاروں پر رکتے ہیں۔" ہو سکتا ہے درمیانہ پولیس کے درمیان میں آجانے کی وجہ سے زنانہ پولیس پینٹ کس لے اور پینٹ کی طرح چست ہو جائے۔ ویسے تو چٹون مردانہ پولیس کی کارکردگی بھی بہتر نہیں بنا سکی۔ سوا آگر لباس ہی سے پولیس کو چست کرنا ہے تو پھر انہیں لاپے پہنائیں۔

بستہ ہی ہوتا ہے۔ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے کہا، مجھے پتہ چل جاتا ہے یہ کلاس انٹرگریجیشن کی ہے یا گریجویٹس کی۔ ہم نے پوچھا: ”کیسے؟“ بولے: ”جب میں کہتا ہوں ’گنڈ آف نون‘ تو انٹرگریجیشن جواب میں گنڈ آف نون کہتے ہیں۔ لیکن جب میں گریجویٹس کو یہ کہتا ہوں تو وہ اس کے نوٹس لینے لگتے ہیں۔“ اگرچہ ہمارے ہاں علم کا کوئی وزن نہیں رہا، پھر بھی کلاس جتنی چھوٹی ہوتی ہے، بے انتہا بڑے ہوتے ہیں۔ سکول کے بچوں کے وزنی بستے دیکھ کر ہمیں خوش ہوتی ہے کہ ہم نے بھلے وقتوں میں تعلیم مکمل کر لی۔ ورنہ ہم سے تو یہ اٹھائے ہی نہ جاتے۔ لوگ ہمیں دیکھ کر کہیں پوچھتے: ”آپ کس ہسپتال میں ہوتے ہیں؟“ بچپن میں یہی خرابی ہے کہ یہ ابتدائی عمر میں آ جاتا ہے اور سیاست دانوں کو ملنے کے بعد لگتا ہے: ”پھر یہ ساری عمر نہیں جاتا۔“ عظیم باکسر محمد علی کہتا ہے: ”نوٹس دہلی میں جب میں بچہ تھا تو والدین نے مجھے نئی سائیکل لے کر دی۔ میں اسے جیم کے باہر کھڑی کر کے اندر گیا۔ باہر آیا تو کسی نے چرائی تھی۔ مجھے شاید صدمہ ہوا۔ ساتھ ہی ایک پولیس والا رہتا تھا۔ میں اس کے پاس گیا اور بتایا کہ جس لڑکے نے میری سائیکل چرائی ہے، میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ جب پولیس والے کو پتہ چلا کہ مجھے تو لڑائی نہیں آتا تو اس نے کہا: ”پہلے لڑا لیتا سو۔ اس طرح میں بانگ کی طرف آیا۔ اس دن تو چور میرے ہاتھ نہ آیا لیکن ہر بار جب میں رنگ میں اترتا تو دوسرے کے بازو دیکھ کر میں اپنے آپ سے کہی کہتا: ”اسی نے میری سائیکل چرائی تھی۔“ ہمارے ہاں تعلیم یافتہ لوگوں کا جو رویہ ہے، اس سے لگتا ہے وہ بڑے ہو کر کسی کو اپنے بستے کا قصور وار سمجھتے ہیں۔ بچوں کی پرورش پر کئی کتابیں لکھی گئیں، ”پروہ اتنی بہتر نہیں ہو سکتی کہ آج کے بچوں کی پرورش کے لیے پچاس سال پہلے کے بچوں کی کتابیں کیسے مفید ہو سکتی ہیں۔ آج کے بچے اتنے سائنٹفک ہیں کہ ہمارے دوست کے بیٹے نے زمین پر گر کر اگلدان توڑ دیا۔ ہم نے ڈانٹا تو بولا۔ یہ میری وجہ سے نہیں گرا۔ یہ تو کشش ثقل کی وجہ سے گرا ہے۔ آج کانو کھلا ڈاٹھ لکھنے کو چاند نہیں ملتا، کیونکہ اسے پتہ ہے چاند نہ گرے۔ تھاٹی لینڈ ہی کے ایک سکول کی بچی کا واقعہ ہے۔ اس کا مذہبی رہنما اپنے اس کہانی نیا کر تھا۔ ایک رات اس نے بڑی ہی مزیدار کہانی سنائی۔ لڑکی بڑی متاثر ہوئی۔ اس نے باپ سے پوچھا: ”پاپا یہ

واقعی سچی کہانی ہے یا آپ واعظ کر رہے ہیں؟“

بچپن ہر کسی کو اچھا لگتا ہے جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ بچپن میں آپ کے بچے نہیں ہوتے۔ آپ کے بچے کھتے آگے جائیں گے، یہ اس پر ہے کہ آپ نے گاڑی میں کتنا پٹرول چھوڑا ہے۔ آج کل بچوں کو کہا جاتا ہے: ”پڑھو لکھو گے نہیں تو پھر ہر جگہ کیش ی دی کر دو گے۔ سرکاری سکولوں میں تو چھٹیاں ہی رہتی ہیں۔ ایک بچہ کہہ رہا تھا: ”ہم تو چھٹیوں سے اتنا تنگ جاتے ہیں کہ تھکاوٹ اٹارنے کیلئے اور چھٹیاں کرنی پڑتی ہیں۔“ بچے امتحان پاس کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں، یہاں تک کہ پڑھ بھی سکتے ہیں۔ سکولوں کی افادیت کے سب قائل ہیں کہ آج بھی اچھے سکول میں بازار سے سستا ملتا ہے۔ ہمیں یاد ہے ہمارے ڈرائنگ ماسٹر نے تو مرغانا سیکھا ہی ہم پڑھا، لیکن آج کل کے طلباء خود ہی استاد ہیں۔ جرمن کہادت ہے جو خود اپنا معلم ہوتا ہے اس کے شاگرد احمق ہوتے ہیں۔ حکومت کے نزدیک بچوں کے بارے میں سوچنا بچکانہ کام ہے۔ فی زمانہ لوگ تھوڑے بچوں کے ساتھ گزار کر لیتے ہیں، باقی ماندہ شور شراباں دی مچا لیتا ہے۔ ٹی وی کی ایجاد کا مقصد دراصل ان پڑھوں کو عینک لگانے کا بہانہ پیدا کرنا تھا۔ پی ٹی وی ایسا ہے کہ عقل مند اور بے وقوف دونوں ایک سال دیکھ لیں تو بچکانا مشکل ہو جائے گا کہ عقل مند کون تھا۔ وسط ایشیائی ریاستوں میں تو تعلیم ہی نہیں، تعلیم یافتہ بھی عام ہیں۔ وہاں کے تو جاہل بھی تعلیم یافتہ ہیں۔ ہم نے ازبکستان میں تابانی گروپ کے منیجر کے گھر پر تن دھونے والی ملازمہ ایم اے بیالو دیکھی۔ نیشنل بینک آف پاکستان ازبکستان رانچ کے منیجر کے گھر صفائی کرنے والی ملازمہ ہٹری میں پی ایچ ڈی تھی۔ پہلے علم ایک دولت تھا، اب دولت ایک علم ہے، جس کا عالم بننے کے لیے لوگ سیاست میں آتے ہیں۔ پکاسو نے ایک بار کہا تھا: ”میں حیران ہوں کہ لوگ آرٹ دیکھنے کی بجائے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی پرندے کا گانا سمجھنے کی کوشش کرنا۔ بھلے لوگو اسے سنوا اور انجوائے کر دو۔“ ہم سیاست کو بھی آرٹ سمجھتے ہیں یعنی صرف دیکھتے ہیں۔ کبھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ جرمن کہادت ہے عاشق، شاعر، سیاستدان اور مفتی کو جھوٹ بولنے کا حق حاصل ہے۔ اگرچہ ہماری خواہش ہے کہ ان سب کو بچ بولنے کا حق بھی ملنا چاہیے۔ ہم سمجھتے ہیں بڑے



دولہوں کا ملک

انگولا شادی شدوں، سوڈین غیر شادی شدوں، جاپان بیویوں، روس بچوں، امریکہ اور انگلینڈ مطلقوں کے ملک ہیں جب کہ پاکستان دولہوں کا ملک ہے۔ یہاں کے دولہے اپنی پائیداری اور آئینہ سبیل سروس میں اتنے مشہور ہیں کہ بیرون ملک مقیم پاکستانی گھر میں ہر چیز بدیسی رکھتے ہوئے بھی اپنی بیبیوں کے لیے دیسی دولہے لینے پاکستان کا ہی رخ کرتے ہیں۔ گھریلو سامان اور پراپرٹی کے اشتہارات کے ساتھ ساتھ دولہے دستیاب ہیں کہ اشتہاروں

سیاست دان سے اچھا پلیئر، معاشرے کے لیے زیادہ مفید ہوتا ہے۔ سیاست دانوں سے تعلیم کی باتیں کرو تو انہیں نیند آنے لگتی ہے۔ اس لیے ہم بچوں کو ہی کہتے ہیں کہ وہ بستوں کے وزن تلے نہیں لیکن یہ بھی ڈر لگتا ہے کہ کہیں ان کے ساتھ اس بچے کی طرح نہ ہو جو ماں کے پاس روتا ہوا آیا اور بولا: ”اباجان دیوار میں کیل گاڑ رہے تھے تو ہتھوڑا ان کے ہاتھ پر لگ گیا۔“ ماں بولی: ”بیٹا بہادر بچے اتنی سی بات پر رویا نہیں کرتے، تمہیں تو ہنس دینا چاہیے تھا۔“ اُمی ہنسی تو تھا۔“

طویل خرگشوار ازدواجی زندگی کا راز کیا ہے؟ انہوں نے کچھ دیر منہ میں کچھ گنا اور پھر کہنے لگیں: ”ہم دونوں کو تلخ سوالوں کا جواب دینے سے پہلے دس تک گنتی کرنے کی عادت ہے۔“ ایک ڈیج لڑکی نے ماں سے پوچھا: ”ماں بیاہ کیا ہوتا ہے؟“ ماں بولی: ”مکاتا بچہ جتنا اور روتا۔“ ڈیانا نے شادی کے بعد آخری دو کام ہی کیے۔ ڈیج کہات ہے جو تین بچوں والی عورت سے شادی کرتا ہے، چارہ چوروں سے بہار چاتا ہے۔ ڈیانا اگرچہ بچوں والی ہے پھر بھی اس کے بارے میں کئی شادی شدہ کنواروں کی طرح دن کو خواب دیکھتے ہیں۔ رات کو شاید اس لیے خواب نہیں دیکھتے کہ وہ اندر سے میں نظری نہیں آتے۔ پھر بچوں سے پاکستانیوں کو اتنا پیار ہے کہ ہمارے ہاں تو گاؤں کی عورتیں پیشہ کے خانے میں بچوں کی تعداد لکھتی ہیں۔ خرشمال خاں تنک کی بے پناہ تحقیقی صلاحیتوں سے کون واقف نہیں۔ ان کے 58 لڑکے اور 32 لڑکیاں تھیں۔ ممتاز مفتی سے لے کر مصطفیٰ کھر تک بے شمار دولہے ہیں جنہیں بچوں سے اتنا پیار تھا کہ جب بھی شادی کی، بچوں والی عورت سے کی۔ زیادہ باتیں کرنے والے کو باتوں اور سننے والے کو شوہر کہتے ہیں۔ عورتیں زیادہ باتیں شاید اس لیے کرتی ہیں کہ مرد سمجھ نہ سکیں۔ بہر حال یہ طے ہے کہ بڑی عورت کا خاندان ہوتا دراصل چھوٹا ہوتا ہے۔ یہاں بڑی عورت سے مراد حق اور فن میں عروج حاصل کرنے والی اداکارہ انجن نہیں ہے، ویسے بھی اداکارہ سے شادی کرنا تو میک اپ کی دکان پر ملازمت کرتا ہے۔ 64 سالہ انجی ٹیلر جو پلاسٹک سرجری کے بعد 32 سال کی گنتی ہے، کہتی ہے: ”پلاسٹک سرجری سے عورت کی عمر کم نہیں لگتی، اس سے شادیاں بھی کم لگنے لگتی ہیں۔“ اس کے خیال میں دوسرے لائسنسوں کی طرح میرج لائسنس کی بھی ہر سال تجدید ہونا چاہیے۔ دنیا میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو شادی شدہ ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جو اس پنہ ہوتے ہیں۔ بکشتو کشد کے اس قدر خلاف ہوتے ہیں کہ وہ فوج میں بھرتی ہوتے ہیں نہ شادی کرتے ہیں۔ اگر بیوی خاندان کے ساتھ عزت سے پیش آئے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اسے خاندان بناتی ہی نہیں۔ جو بھنگر کے ایک ہفت روزہ نے لکھا کہ ایک بارونی منڈا نے منڈر منڈا کی اتنی پٹائی کی کہ صدر کے گن میں کا صبر جواب دے گیا اور اس نے پھول نکال کر کہا کہ وئی نے اگر اب ہاتھ اٹھایا تو وہ گولی چلا

سے پاکستانی اخبار بھرے ہوتے ہیں۔ شاید اسی شہرت سے متاثر ہو کر اخباری اطلاعات کے مطابق لیڈی ڈیانا بھی دولہے کی تلاش میں پاکستان آ رہی ہیں۔ سنا ہے اس خبر سے مولانا عبدالقادر آزاد بہت خوش ہو گئے۔ وہ ایک عرصہ سے ڈیانا کو مشرف بہ اسلام کرنے کے موڈ میں ہیں۔ ڈیانا کا تعلق شاہی خاندان سے ہے۔ مولانا عبدالقادر آزاد بھی اسی نام کے محلے میں مقیم ہیں۔ دنیا میں سب سے آزاد و آزاد امیداری ہو تا ہے لیکن ہمارے ہاں سب جسے آزاد کہتے ہیں، وہ مولانا آزاد ہی ہیں۔ محل ایسی کہ جب ان کی شادی نہیں ہوتی تھی، تب بھی شادی شدہ لگتے تھے۔ سکول میں بھی ان کا پسندیدہ فقرہ ”قبول ہے، قبول ہے“ کہتے ہیں۔ ”قبول ہے“ پر کیسے تھا ہر وقت حق کہتے اور ”حق کرنے“ کو تیار رہتے ہیں۔ دیکھتے ہیں ڈیانا کو رولہ ”حق“ پر کیسے لاتے ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں مشہور عورت سے شادی کرنا دراصل اس سے نہیں، اس کی شہرت سے شادی کرنا ہے۔ ایک ایسی ہی محترمہ کی حالت نازک تھی۔ ڈاکٹر نے اس کے خاندان سے کہا: ”آپ پریشان تو ہوں گے مگر ہمیں افسوس ہے کہ اب کچھ نہیں کیا جاسکتا۔“ یہ سن کر خاندان بولا: ”کوئی بات نہیں ڈاکٹر صاحبہ۔ مجھ میں اتنی قوت برداشت ہے۔ جہاں میں اتنے برس پریشان رہا، چنہ کھنے اور دھو لوں گا۔“ ہمارے ہاں شادی سے پہلے لڑکی کو دیکھنا سہرا سمجھا جاتا ہے اور بعض اوقات شادی کے پچیس سال بعد بھی۔ لیکن ڈیانا کو عقاب ہم نے دیکھا ہے، اتنا چارلس نے نہ دیکھا ہو گا۔ زندگی میں دو چیزیں حاصل کرنے کے قابل ہوتی ہیں۔ پہلی چیز وہ جو آپ چاہتے ہیں اور دوسری چیز اس سے لطف اندوز ہونا۔ دوسری کا حصول پہلی سے مشکل ہے۔ اسے تو شہزادہ چارلس بھی حاصل نہ کر سکا۔ ڈیانا اور چارلس کی طلاق کی جو دو وجوہ تھیں، ایک کا نام شہزادہ چارلس اور دوسری کا نام لیڈی ڈیانا تھا۔ دیے بھی وہاں اتنی جلدی طلاق ہوئی ہیں کہ ایک اداکارہ نے بالوں میں رولر لگا کر شادی کی تاک طلاق تک بال سیٹ ہو جائیں۔ امریکہ اور برطانیہ تو ویسے ہی مطلقوں کے ملک ہیں۔ یہ عالم ہے کہ امریکی ایکٹریں جین اکیرو اور روڈلف والیسو نے شادی کا بندھن باندھتے ہوئے ہمیشہ ساتھ رہنے کی قسم کھائی اور ٹھیک 45 منٹ بعد دونوں میں طلاق ہو گئی۔ ہم نے اپنی ممتاز ادیبہ کی شادی کی گولڈن جوبلی پر ان سے پوچھا: ”آپ کی اس



ادواستان

ہم تو محترمہ حکومت کی چھائیوں اور اچھائیوں پر ہی نظر رکھتے ہیں۔ سو ہمیں اس پر فوجی ہوئی کہ حکومت نے ہر شعبے میں عورتوں کو مردوں کے شانہ بشانہ لانے کے لیے جرائم میں بھی عورتوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ان کی سزائے موت معاف کر دی ہے۔ ہو سکتا ہے مزید رعایتیں دی جائیں۔ جیسے ایک جرم جن نے اپنے ہسپتال کی مشہوری کے لیے اعلان کیا تھا کہ جو دو بڑے آپریشن ہمارے ہسپتال سے کرائے گا اس کے بیچ کا

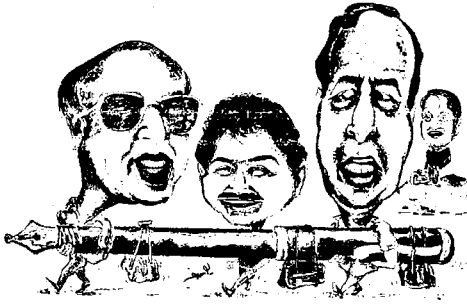
دے گا۔ اس کے بعد سے منڈیلا گارڈز کے بغیر تنہائی میں وئی سے نہ ملتا لیکن ڈیانا چارلس کے ساتھ ہمیشہ اس قدر احترام سے پیش آتی کہ لگتا ان کے درمیان میاں بیوی کا رشتہ ہے ہی نہیں۔ ہمارے اور انگریزوں کے مزاج میں اتنا فرق ہے 'بختارنگوں کا ہے۔ انگریز چٹا سر پہر کی چائے اور ڈنر کو عادت سمجھتے ہیں۔ ہم عادت نہیں سمجھتے۔ ہم تو دل لگا کر رشتہ سے کھاتے ہیں۔ انگریز پلاٹونک محبت کم کرتے ہیں ہمارے ہاں پلاٹونک محبت کا یہ عالم ہے کہ ہمیں جو بھی کوئی خالی پلاٹ نظر آئے ہم اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ کراچی کی آب و ہوا پاکستان کے حالات امریکہ کے وعدہ اور عورت کے مزاج پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ مرد کو ایک روپے والی چیز پسند آجائے تو وہ اسے دو روپے میں بھی خرید لے گا لیکن عورت کو دو روپے والی چیز ناپسند بھی ہو تو اسے ایک روپے میں خریدنے پر تیار ہو جائے گی۔ ہم کو یہ تو نہیں پتا کہ ڈیانا کو کونسا دلہا پسند آئے گا لیکن اتنا پتا ہے وہ سیاسی دلہا نہ ہوگا کیونکہ وہ اور جھوٹا ہوتا ہے۔ ڈیانا لو میرج کی قائل ہے۔ فرانسیسی کہاوت ہے: "معاشقہ کی شادی میں راتیں اچھی اور دن برے ہوتے ہیں۔" پتہ نہیں یہ برے دن کس کے آئے ہیں۔ ہمیں تو لگتا ہے ڈیانا کی پہلی شادی دراصل اس کی دوسری شادی کی تیاری تھی۔ پاکستان میں نا تجربہ کار دوہوں کے ساتھ ساتھ کئی تجربہ کار دوہے بھی ڈیانا کو شہزادی سمجھ کر سہارا دینے کے لیے تیار ہیں لیکن ایک دوہے نے ہمیں بتایا کہ میں ڈیانا کو شہزادی یا دولت مند سمجھ کر اسے شادی کی آفر نہیں کر رہا بلکہ خلوص نیت سے صرف اسے چاہتا ہوں۔ ایسے ہی ایک صاحب کو اگلیڈن کے ایک امیر کبیر گھری لڑکی پسند آگئی۔ شادی کے لیے اس کے باپ سے بات کی تو اس نے کہا: "اگر میری بیٹی کے پاس ایک پائی بھی نہ ہوتی پھر بھی اس سے شادی کر لیتے؟" موصوف بولا: "ہاں۔" تو لڑکی کے والد نے کہا: "جداؤ اپنا رستہ نا پو۔ ہماری فیملی میں پہلے اس حق کم نہیں ہیں۔"

۔ باقی جرائم میں کمی بھی اس صورت ممکن ہے کہ ان پر سزائیں ختم کر کے ٹیکس لگادے
 میں۔ یہی نہیں اس سے بجٹ کا خسارہ بھی پورا ہو جائے گا۔ اگرچہ ہر سال بجٹ کا خسارہ
 ہی ہوتا ہے جو جون میں ہماری جون بدل دیتا ہے۔ بجٹ اور پلان میں یہ فرق ہوتا ہے کہ
 پ کرنا چاہتے ہیں اسے پلان کہتے ہیں اور جس وجہ سے نہیں کر پاتے اسے بجٹ کہتے
 ہیں۔ عوام کے پاس آج کل سر چھپانے کو گویا رہ گئی تھی۔ اس کی قیمت پر بھی 55 فیصد
 س لگایا گیا۔ اس پر احمد اسلام امجد کو احتجاج کرنا چاہیے۔ ہال کٹوانے پر ٹیکس تو شاید سکھ
 ہب سے خیر سگالی کے طور پر لگایا گیا ہو لیکن بجٹ کے بعد ہم ہال کٹوانے گئے تو بارہ نے
 'ہال کٹوانے کے چالیس روپے'، 'پوچھا: "شیو کر نے؟" کہا: "پانچ روپے۔" عرض
 "پھر ہمارے سر کی شیو کر دو۔" "پشٹو کہا: ہاتھ سے ڈوبتا آدمی اسٹرے کو پکڑ لیتا ہے۔ اس
 روح استرا حکومت کے ہاتھ آگیا ہے۔ تاجر بھی ٹیکس کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں۔
 ارے خیال میں وہ یہ سب حکومت کی بہتری کے لیے کر رہے ہیں۔ جیسے ہمارے ایک
 ر حوم محقق اور نقاد ستار طاہر فرخ پھر خریدتے ہوئے بڑا بھاؤ تاؤ کر رہے تھے۔ ہم نے انہیں
 ہا: "آپ نے ادھار فرنیچر لینا ہے۔ پھر آپ ادھار لے کر واپس بھی نہیں کیا کرتے، پھر
 یوں اتنا بھاؤ تاؤ کر رہے ہیں؟" بولے: "دکاندار میرا دوست ہے۔ میں چاہتا ہوں اسے کم
 سے کم نقصان ہو۔" ہمارے ہاں آج کل جو گلشن لکھا جا رہا ہے اس میں انکم ٹیکس کے ریٹرن
 بھی شامل ہیں۔ تنخواہ دار بے چارہ ایک تنخواہ سے حکومت اور گھر کیسے چلائے؟ ٹیکس دینا کوئی
 نئی بات نہیں۔ ٹیکسلا شہر کو ٹیکسلا کہتے ہیں اس لیے ہیں کہ جو حملہ آور فتح کرتا وہ یہاں کے
 باشندوں سے کہتا: "ٹیکس لاؤ۔" میں اس کا نام "ٹیکس لاؤ" دیکھا۔ اب تو پورا ملک ہمیں "ٹیکس
 لاؤ" کہنے لگا ہے۔ غریب کی داستان، اداسان بن گئی ہے۔ پشٹو معاویہ کے مطابق غریبوں
 کے گھر مسجد لگتے ہیں یعنی فرنیچر اور گھریلو سامان کے بغیر۔ ایک ایسا کہتا ہے: "حکومت
 غریبی ختم کرنا چاہتی ہے مگر میرے خرچے پر۔" جرائم کم کرنے کے ہر ملک کے اپنے
 طریقے ہیں۔ کچھ ملکوں میں پولیس کم کر کے یہ مقصد حاصل کر لیا گیا۔ جرمنی کی رکن
 پارلیمنٹ لورسل نے جنسی تشدد، چوری، دہشت گردی اور دیگر جرائم روکنے کے لیے تجویز پیش کی
 تھی کہ فروغ آفتاب کے بعد مردوں کے سڑکوں پر نکلنے پر پابندی لگادی جائے۔ نتیجہ

آپریشن فری کر دیا جائے گا۔ ویسے تو خواتین پر فیملڈ میں مردوں سے آگے ہیں اس لیے ہم
 نے مردوں کو اکثر عورتوں کے پیچھے ہی دیکھا ہے۔ سپین میں تو کرس ٹیٹا نے بل فائننگ
 میں بھی مردوں کو اپنے پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ کسی نے پوچھا: "آپ پہلی بار بل فائننگ کے
 لیے میدان میں اتریں تو آپ کو اس کا تجربہ تھا؟" بولی: "ہاں۔ میں شادی شدہ تھی۔
 ہماری حکومت نے خواتین کو کچھ کر کے دکھانے کا نادر موقع بلکہ "نادر شاہی" موقع
 ہے۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ مرد ہی طرح جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ عورتیں اچھی طر
 کرتی ہیں لیکن کیوں؟ وجہ کوئی ماہر نفسیات ہی بتا سکتا ہے۔ ویسے تو کہتے ہیں عورتوں کی
 نسبت مردوں میں تحلیل نفسی جلد ممکن ہوتی ہے۔ مردوں کو داہیں بچپن میں لانا آسان
 ہوتا ہے کیونکہ وہ پہلے ہی اس سے زیادہ درد نہیں ہوتے۔ مردوں کا عورتوں سے رویہ وہ
 رویہ ہوتا ہے۔ اس لیے یہ مت دیکھیں مرد جس کے ساتھ ہے اس کے ساتھ اس کا رویہ
 کیا ہے یہ دیکھیں جسے وہ چھوڑتا ہے اس کے ساتھ کیا ہے۔ اس طرح کہتا ہے جب قدرت
 کسی کو مرد بنانے میں ناکام ہوتی ہے تو اسے عورت بنادیتی ہے۔ میڈیکل سائنس کہتی ہے
 "ہر بچہ پہلے لڑکی ہوتا ہے بعد میں کچھ لڑکا بن جاتے ہیں۔" آج تک یہ سمجھ نہیں آئی کہ
 پاکستانی جرائم کیوں کرتے ہیں۔ جب تک بددیانتی کرنے کے قانونی راستے موجود ہیں۔ شاید
 ان راستوں پر پولیس سے بڑھ کر خطرہ ہو۔ ایک مجرم کہہ رہا تھا میں جب بھی برائی کے
 راستے پر چلتا ہوں اس راستے پر پولیس ہوتی ہے۔ باہر کی پولیس وہ چیزیں ڈھونڈتی ہے جو
 کھوئی ہوئی ہیں۔ ہماری وہ ڈھونڈتی ہے جو ابھی کھونا ہوئی ہیں۔ ہم نے ایک صفائی سے پوچھا
 "آپ کو کیسے پتہ چلا کہ یہ پولیس والا لیٹ پیٹڈ ہے یا رات پیٹڈ؟" کہا: "آسان ہے۔ اگر
 وہ اپنی تمام رقم دائیں جیب میں رکھتا ہے تو وہ لیٹ پیٹڈ ہے۔"

کہتے ہیں جرائم کبھی پے نہیں کرتا۔ شاید یہ اس لیے کہتے ہیں کہ جب یہ پے کرتا ہی تو
 اسے جرائم نہیں کہا جاتا۔ ہمارے ہاں برکام وہ ہوتا ہے جو دوسرا کر رہا ہوتا ہے اور بڑا کام وہ جو
 آپ خود کر رہے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں نور جہاں کی عمر اور پاکستان کے حالات میں تبدیلی
 نہیں آسکتی۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں پاکستان سے کرپشن کا خاتمہ تو ممکن ہے۔ کسی مترجم کے
 ذمے لگائیں۔ وہ اس لفظ کا اردو میں ترجمہ کر دے۔ یوں "کرپشن" سے تو جان چھوٹ سکتی

حکومت نے جیلوں میں مجرموں کو بیویوں کے ساتھ رکھ کر جرائم کم کر لیے، جس کی وجہ کوئی شادی شدہ ہی بنا سکتا ہے۔ ہمیں اپنے ایک مقبول اداکار کا واقعہ یاد آگیا۔ پروڈیوسر نے کہا ”شوٹنگ ساری رات چلے گی اس لیے وہ اپنی بیوی کو بنا کر آئے کہ اسے ساری رات گھر سے باہر رہنا ہے۔“ اداکار بولا: ”میرے خطرناک کام کرنے کے لیے ڈیڑھ گھنٹہ ہیں، تو پھر میری بیوی کو یہ اطلاع دینے کا کام اسی سے کیوں نہیں لیتے۔“ اگرچہ شوپنہار کہتا ہے، ”عورتوں اور مذہبی رہنماؤں کو آزادی دینا خطرناک ہوتا ہے۔ پھر بھی امریکہ میں یہ تبدیلی آئی ہے کہ پہلے وہاں عورتیں مردوں کے قتل کا جو سامان اپنے پیس میں رکھتیں، وہ صرف اپ اسٹک تک محدود ہوتا۔ اب تو اسٹک اور پستول بھی رکھتی ہیں۔ اللہ نے نئے توفیق دی ہے، وہ میرے جواہرات جڑے دستے والا پستول رکھتی ہیں۔ ہمارے ہاں چونکہ عورت کو مرد سے کمتر سمجھا جاتا ہے، سو وہو سکتا ہے اس کے جرم کو بھی کمتر سمجھتے ہوئے حکومت نے ان کی سزائے موت ختم کر دی ہو۔ شریعت کی رو سے دو عورتیں ایک مرد کے برابر ہوتی ہیں۔ اسی لیے ایک زمانے میں جب سینکڑوں غیر حاضری میں ایک اجلاس کی صدارت بیگم شاہ نواز کو کرنا تھی تو ایک رکن نے کہا: ”شریعت کی رو سے دو عورتیں ایک مرد کے برابر ہیں۔ اس لیے سینکڑوں کی عورت کی بجائے دو عورتیں بیٹھیں۔“ یہ تو بھلا ہو، آصف زرداری کا جس کی وجہ سے بے نظیر درویشی یہ کمی محسوس نہیں ہوئی۔ ورنہ وہ ہوسکتا تھا کوئی مذہبی جماعت کہتی کہ دو درویشی عظیم ہوں۔ ہو سکتا ہے حکومت عورت کے ایک قتل کرنے کو نصف قتل سمجھتی ہو۔ ہمارے ہاں وزیراعظم کو سزائے موت دینے کا بھی رواج ہے۔ سو ممکن ہے محترمہ بے نظیر بھٹو نے سزائے موت ختم کر کے خود کو تسلی دی ہو، لیکن کہا جا رہا ہے یہ سب عورتوں کی بھلائی کے لیے کیا گیا ہے۔ جس پر عورتوں کی حالت ویسی ہی ہے جیسی اس ڈاکٹر کی بات سن کر مریض کی ہوئی تھی، جس نے کہا تھا: ”مبارک ہو۔ آپ کے کان کا آپریشن کامیاب ہوا۔“ مریض بولا: ”کیا کہا؟ ڈاکٹر زور سے بولو۔“



جملہ تیموریہ

ہم کئی دنوں کے بعد وطن واپس آئے ہیں تو یہاں کے حالات جوں کے توں دیکھ کر عجیب سی خوشی ہو رہی ہے۔ بقول عطاء الحق قاسمی حالات کو جوں کا توں پا کر اس لیے خوشی ہو رہی ہے کہ ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ حالات کی خرابی کی وجہ ہم نہیں ہیں ورنہ ہماری غیر موجودگی میں حالات بہتر ہو چکے ہوتے۔ ہم ازبکستان رائلٹری یونین کی دعوت پر عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد اور طاہر اسلم گورا کے ساتھ تاشقند گئے ہوئے تھے۔ دو

طرح چلتی نظر آئی۔ ہم امیر تیمور کا مجسمہ دیکھ رہے تھے تو ایک کاغیڈ بولا ”امیر تیمور ہے آج کل جو اس آزاد ملک میں دیکھ رہے ہو اس کی بدولت ہے“ تو پاس کھڑا ایک ازبک بولا ”سارا الزام ایک شخص کے سر ڈال دینا چاہتی ہے“ وہ اسے امیر تیمور لنگ گورکان کہتے ہیں۔ شاید گورکان اس لیے کہتے ہیں کہ اس زمانے میں گورکان اسے اپنی ہی برادری کا بندہ سمجھتے تھے۔ امیر تیمور کا حجاز سرقد میں ہے۔ حجاز کے ساتھ یوں گھرے ہیں کہ لگتا ہے انہیں پتہ ہی نہیں تھا کہ پاس کون دفن ہے ورنہ وہ احزانہ سہی احتیاطاً ہی گھر ڈالنے سے بچتے۔ ہمیں پتہ چلا ازبکستان میں ایک قبائلی علاقہ ایسا ہے جس کا نام کراکل پاکستان ہے وہاں مہمان کے آنے پر دنبہ ذبح کر کے مہمان کو دینے کی زبان کھلاتے ہیں جب تک وہ کھانے سے اسے گھر سے نہیں نکلے دیتے۔ بیویوں کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو پاکستانی کرتے ہیں۔ تیمور لنگ کے مقبرے کے بعد ہم شاہ زندہ قبرستان گئے اس کی میز صیوں کے بارے میں روایت ہے کہ چڑھتے ہوئے گھنٹیں اور پھر اترتے ہوئے گھنٹیں اور اگر دونوں مرتبہ ایک جتنی نہ ہوں تو اس کا مطلب ہے آپ گناہ کار بندے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی صاحب میٹر حیاں اترتے وقت سب سے زیادہ توجہ اور محنت سے میٹر حیاں گن رہے تھے۔ آخر ان کی محنت رنگ لائی اور میٹر حیاں برابر ہو گئیں۔ روی انقلاب کے بعد سے اس قبرستان میں قبروں پر مردوں کی تصویریں لگانے کا رواج ہوا ہے جو سنگ مرمر کی بڑی بڑی سلوں پر منتقل ہوتیں۔ ہمارے کالموں میں کالم نگار اکثر اپنی جوانی کی تصویر لگاتے ہیں۔ قبروں کی تصویریں دیکھ کر یوں لگا کہ یا تو یہ لوگ جوانی میں مرتے ہیں یا ہم کالم نگاروں سے بہت متاثر ہیں۔ وہاں کے ایک اخبار میں برائے فروخت کے کالم میں ایک خبر تھی ”ایک سینڈ پیڈل گن بہت سستا بیچا جارہا ہے ایسے حضرات کے لیے نادر موقع جن کا نام سٹاف ہو“ اصل مالک ازبکستان چھوڑ کر دس جارہا ہے۔ ”ازبک اپنے ہیر وزے اس قدر محبت کرتے ہیں کہ اگر لینن کا مقبرہ ازبکستان میں ہوتا تو وہ کہتے سے لینن کا نام منگاساں پر امیر تیمور لکھ دیتے۔

سال قبل بھی ہم تاشقند گئے تھے۔ حب اور اب میں یہ فرق تھا کہ پہلے لڑکیاں پاکستانیوں کو دیکھ کر مسکراتی تھیں اب ہنسنے لگی تھیں۔ پچھلی بار ہمیں تاشقند میں امیر تیمور گھوڑے پر سوار ملا تھا اس بار انہوں نے سوار نظر آیا۔ امیر تیمور کے آباؤ اجداد گھوڑے پر پیدا ہوئے اور اسی پر فوت ہوئے۔ صرف شادی کے لیے گھوڑے سے اترتے۔ ہمارے ہاں تو شادی کے لیے گھوڑے پر چڑھتے ہیں۔ رائٹرز یونین کے جنرل سیکرٹری اور ازبکستان کے عوامی ادیب عبداللہ عارف نے بتایا کہ آزادی نے ہمیں زبان ہی نہیں لٹرائی ہمارا ادب اور ہمارے ہیر وز بھی ہمیں لٹرائے ہیں۔ پہلے امیر تیمور کا نام لینا منع تھا ہماری زبان میں لوہے کے لیے لفظ تمور ہے لیکن ہم حصور لکھتے نہ بولتے کہ کہیں اس سے مراد تیمور نہ کر ہمیں پکڑ نہ لیا جائے۔ ہمیں امیر تیمور کے بارے میں اتنا ہی علم ہے کہ وہ میرزا ادیب کی طرح چلتے اور میرزا ادیب آرہے ہوں تو انہیں دور سے دیکھ کر کہتے بھاگ جاتے ہیں کیونکہ ان کی چال سے لگتا ہے وہ چلتے ہوئے مارنے کے لیے پتھر اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ علی شیر نوئی ازبکوں کے قومی شاعر ہیں۔ ہمارے قومی شاعر علامہ اقبال کو تو قولوں نے تالیوں سے پیٹ دیا لیکن علی شیر نوئی کو قدرت نے قوم سے بچانے کے لیے یہ کیا کہ جب علی شیر نوئی کی پانچ سوئیں سالگرہ منانے کا پروگرام تھا تو جھلڑنے سوویت یونین پر حملہ کر دیا۔ 25 سال بعد پانچ سو بیچ سوئیں سالگرہ کے جشن کا اہتمام کیا جارہا تھا تو تاشقند میں زلزلہ آگیا اور پورا شہر غائب ہو گیا۔ 1991ء میں اس کی 550 ویں سالگرہ کا جشن منایا گیا تو دس کا شیرازہ مقرر گیا۔ اس لیے آج کی ازبک امیر تیمور کو منانے کی کوششوں میں ہیں۔ کہتے ہیں ایک بار ایک اندھی عورت جس کا نام محبت خانم تھی امیر تیمور کے پاس لائی گئی۔ تیمور نے کہا ”سنائے محبت اندھی ہوتی ہے“ تو وہ بولی ”اندھی نہ ہوتی تو ننگڑے کے پاس کیوں آئی؟“ تیمور کا ہر جملہ ”جملہ تیمور یہ ہوتا یعنی ننگڑا اور ہمہ اور۔ امیر تیمور نے وہاں 35 سال حکومت کی وہ دنیا میں جو دیکھنا دیکھنا ہی سمجھنا نہیں آتا۔ ایک ملک میں اس نے خوبصورت بادل دیکھا تو دزیروں سے کہا ”سرقد میں ایسا بادل ہونا چاہیے۔“ سندھی کہات ہے ایک ٹانگ والوں کے دیس میں جاؤ تو اپنی ایک ٹانگ کا بندھے پر رکھ لو ”مکانوں“ کے دیس میں جاؤ تو ایک آنکھ بند کر لو ”اہلہ اندھوں کے دیس میں جاؤ تو دونوں آنکھیں کھلی رکھو۔ ہمیں ازبکستان کی معیشت تیمور کی

بڑی دلچسپ ہے۔ اگر بیوی ہے بھی تو کسی اور کی جسے موقع ملنے پر پڑھ لیا جائے تو اس پر تبصرہ ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ کسی سیاست کا قول ہے، تبصرہ لکھنے سے پہلے یہ ضرور دیکھ لیں کہ مصنف کے ساتھ آپ کے تبصرے سے لیے تو نہیں۔ ہم تو اس لیے بھی کتابوں پر تبصرہ نہیں لکھتے کہ اس کے لیے پہلے کتاب پڑھنا پڑتی ہے اور ہم کسی کتاب کو پڑھ لیں تو اس پر اچھا تبصرہ نہیں لکھ سکتے۔ تبصرہ لکھنے میں ہمیں یہ دشواری ہے کہ ساقی فاروقی کی طرح ہمارے پاس کتاب نہیں ہے۔ وزیر آغا صاحب جب لندن گئے تو ساقی کے خوشخوار کتے کو دیکھ کر ڈر گئے، تو ساقی بولے: ”آپ یونہی گھبرا رہے ہیں۔ یہ صرف برے شاعروں پر بھونکتا ہے۔ احمد فراز آئے تو یہ چپ نہ ہوتا تھا۔“ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں میں نے دل میں کہا: ”اگر یہ کتاب واقعی خن شناس ہوتا تو وہ دن رات ساقی کے گھر میں رہتے ہوئے کیوں نہ بھونکتا۔“ ہمارے ہاں یہ کام نقاد ہی کرتے ہیں۔ البتہ یہ ہے کہ اگر تبصرہ لکھتے وقت بہت غصہ آئے تو تبصرہ نگار کو چاہیے، ”کناٹے کر ہا ہیر“ کو نکل جائے۔ واپس آئے تک اس کا غصہ ختم ہو چکا ہو گا۔ نقاد بھی تخلیق کار ہوتا ہے۔ رائٹر ادب تخلیق کرتا ہے تو نقاد اس کی خامیاں۔

ہم بھارت سے آلو، جلیان سے ہانگو اور دوسرے ملکوں سے سفر نامے درآمد کرتے ہیں۔ سفر نامے سرگزشت کا فارن ایڈیشن ہوتے ہیں بلکہ سراسر سرگزشت ہوتے ہیں۔ نثر اس کی پروین عاطف کا ایک سفر نامہ ہے جس میں مصنفہ کے ساتھ ساتھ پڑھنے والا بھی ”سفر“ کرتا ہے۔ اس کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ پڑھنے والے کو جلد ہی پتہ چل جاتا ہے کہ یہ ایک سفر نامہ ہے، ورنہ ہم نے جون ایلیا کی پوری کتاب اس لیے پڑھی تاکہ جان سکیں کہ یہ کس چیز کی ہے؟ آخر جا کے شاعری کی نکلی۔ تاجرو تبخیر کے شاعر جون ایلیا کو ہم نے جس ماہ بھی دیکھا، ہمیں وہ جون ایلیا لگا۔ ان کی زندگی کا پہلا شعر ہے۔

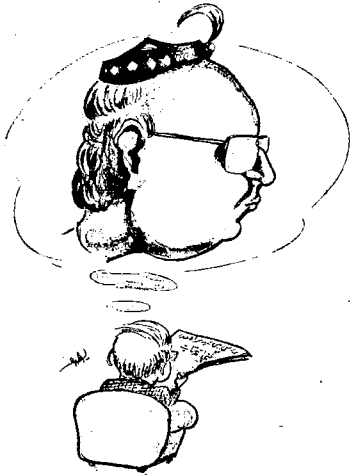
چاہ میں اس کی طمانچے کھائے ہیں
دیکھ لے سرفنی میرے رخسار کی

اپنے شعر پر خود ہی اپنے آپ کو پختے ہیں، جس سے اندازہ لگائیں، ان کا شعری ذوق کتنا بلند ہے۔ اہمیل نیازی اپنے طبع سے کئی کم ہوں کی نمائندگی کرتے ہیں جب کہ جون ایلیا اور پروین عاطف کئی جنسوں کی۔ پڑوانی پڑھ کر لگتا ہے، دورانِ سفر دو تین مرتبہ تو پروین



سراسر گذشت

میراجی نے کہا ہے کتابیں تین طرح کی ہوتی ہیں۔ کتابوں کی ایک قسم وہ ہے جنہیں ہم لکھتے ہیں اور دوسرے پڑھتے ہیں۔ یہ ہماری بیٹیاں ہوتی ہیں۔ دوسری قسم کو ہم گھروں پر اونچی جگہوں پر طاق میں، جزدانوں میں لپیٹ کر اور سجا کر الگ رکھ دیتے ہیں، یہ ہماری بزرگ ہوتی ہیں۔ کتابوں کی تیسری قسم وہ ہوتی ہے جسے دوسرے لکھتے ہیں اور ہم پڑھتے ہیں، یہ ہماری بیویاں ہوتی ہیں۔ پروین عاطف کی کتاب ”میراجی“ ہمیں یوں نہیں لگی کیونکہ یہ تو



سر بر ہنارِ مملکت

روس کے ایک میگزین میں ایک تازہ ترین تحقیق چھپی ہے۔ جس میں یہ انکشاف ہے کہ ہر دوسرا روسی عکراں گنجا ہوتا ہے۔ مثلاً لینن گنجنے تھے، مگر ان کے جانشین جوزف سٹالن کے سر پر گھٹنے ہاتھ تھے، خرد شیف گنجنے تھے، مگر ان کے بعد آنے والا برتھفیلڈ ان سامم سر نہ تھا، ہالوں والا تھا۔ اندروپوف گنجنے تھے، مگر ان کے جانشین چرچیکوف کے سر پر سفید بال تھے۔ گورباچوف گنجنے تھے، مگر بورس یلسن کے سر پر بال ہیں۔ سو آئندہ روسی صدر گنجا ہو گا۔

کو بھی خاتون سمجھا گیا، جب کہ امریکہ میں تو جون ایلیا صاحب کو ایک اہلکار نے ہاتھ روم میں گھسنے سے روک دیا تھا کہ خواتین کا ہاتھ روم دوسری طرف ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں، جون ایلیا کو ان کے لمبے بالوں کی وجہ سے خاتون سمجھا گیا۔ کچھ کے نزدیک زیادہ حواسے شادی کرنے کی وجہ سے۔ جون ایلیا ایسے شاعر گھرانے میں پیدا ہوئے کہ ان کے پیدا ہونے پر والد نے پوچھا: ”نومولود وزن میں تو ہے؟“ اب تو پہلی ہی نظر میں وزن سے گرے ہوئے لگتے ہیں۔ پروین عارف کے گھر کی فضاء ایسی ادبی تھی کہ بات یہ ہو رہی ہوتی کہ رات کو کیا کچے کاغذ تو سننے والے کو لگتا کہ کوئی ادبی ذکا نہ ہو رہا ہے۔ پروین نے ادب میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ وہ ان خواتین میں سے ہیں جنہیں ایک بار دیکھو تو ایک بار ہی نظر آتی ہیں۔ دیکھنے میں وہ پروین عارف کی ملازمہ لگتی ہیں۔ مردوں کے ساتھ مردوں کی طرح ملتی ہیں۔ کسی کو پریشان نہیں دیکھ سکتی، اس لیے بہت کم آئینہ دیکھتی ہیں۔ دوسروں کی خوشی، غمی میں خود کو اس قدر انوالو کر لیتی ہیں کہ شادی کسی کی ہوتی ہے، شریا رہی ہوتی ہیں۔ عزت کسی کی لگتی ہے، شرم سے کئی دن یہ گھر سے نہیں نکلتی۔ جب لکھتی ہے تو دوسروں کو دکھا دکھا کر کہتی ہے، ’کوشش کی ہے‘۔ ”دیکھنا بتائی بھی ہے یا نہیں۔“ پہلے بچے کی پیدائش پر بھی یہی کہا تھا۔ پروین عارف کی وہ تخلیقات جو خواتین میں زیادہ مشہور ہوئیں، ان میں نیروائی اور غل عارف قابل ذکر ہیں۔ لگتا ہے، پروین عارف کی کتاب کی کاپی جوڑنے والا ان کا فین تھا۔ اس لیے اس نے اسے اپنی پسند کی ترتیب سے جوڑا یعنی جو صفحہ زیادہ دلچسپ لگا، اسے پہلے جوڑ دیا۔ کئی سوکنا ہیں بچکنے کے باوجود کسی قاری نے شکایت نہیں کی۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ پروین عارف کے قارئین اسے کتنا سمجھتے ہیں۔ شکر ہے گیلیلیو اردو کا سفر نامہ نگار نہیں تھا، ورنہ لکھتا: ”دنیا میرے گرد گھومتی ہے۔“ پروین عارف مانتی ہیں، دنیا میری بجائے سورج کے گرد گھومتی ہے۔ اس کا سفر نامہ پڑھنے کے بعد ہمیں بھی دنیا گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے اپنے سفر نامے میں دنیا تین افسانے یوں چھپائے ہیں کہ انہیں دھونڈتے دھونڈتے بندہ پوری کتاب پڑھ جاتا ہے۔

تب ان کے لیے خود چنانا ملک چلانے سے زیادہ مشکل تھا۔ یادداشت ایسی تھی کہ ایک تقریب میں وہ غیر کلمی مہمان کا نام بھول گئے اور اپنی سکرٹری کو قریب بلا کر پوچھا: ”ان کا نام کیا ہے؟“ اس نے بتایا: ”ان کا نام ڈیپٹی اور آپ کا برٹنیف ہے۔“ پہلے ماسکو کوچینک آتی تو دنیا کو نزلہ لگ جاتا۔ اب تو کلکشن کو نزلہ ہو تو ماسکو چھینکے لگتا ہے۔ وہاں اب جمہوریت کا دور دورہ ہے۔ 1995ء میں روسی ٹی وی پر ایک مذاکرہ ہوا جسے دیکھنے والوں نے مذاکرہ کر کہا۔ اس میں انتہا پسند سیاست دان زرینو سکی نے اپنا شراب کا گلاس مخالف سیاست دان کے منہ پر اڑا دیا جس نے اس کے ساتھ بھی جی بکھ گیا۔ یہ منظر لاکھوں روسیوں نے دیکھا کیونکہ یہ پروگرام براہ راست دکھایا جا رہا تھا۔ مباحثے کے میزبان نے اس دوران معزز سیاست دانوں کو گھونٹے بھی رسید کیے۔ ماسکو ٹی وی پر ہونے والے اس مذاکرے کا موضوع تھا: ”جمہوریت میں شخصی آزادی۔“

دیکھو کی جانبیاد اور سیاست دانوں کی جائے داوے و قوفوں کے سر پر فتنی ہے۔ ویسے اگر بے وقوف نہ ہوتے تو دنیا بیک تباہ ہو چکی ہوتی۔ ہماری ٹریڈر یہ ہے کہ ہمارے جتنے اچھے رہنما ہیں، سب مردہ ہیں اور جتنے برے حکمران ہیں سب سائب ہیں۔ کیونکہ موجودہ حکمران برا نہیں ہوتا۔ اسے یہ کہو تو برا ہوتا ہے۔ ہمیں اپنے سیاست دانوں کی نیت پر شک رہتا ہے دیئے انہوں نے یہ شہرت دن رات کی محنت سے حاصل کی اور اپنی اس شہرت کو قائم رکھنے کے لیے بھی انہیں دن رات محنت کرنا پڑتی ہے۔ الیکشن سے پہلے ایک رہنما نے کہا: ”اس ہمارا پارٹی دیانت دار امیدوار کھڑا کرے گی۔“ تو ایک صحافی بولا: ”اس بار آپ کو کھڑا ہونا چاہیے تھا۔“ ہر حال ہمیں یہ روسی تحقیق وہاں کی عورتوں کے خلاف سازش لگتی ہے۔ ایک سروے کے مطابق دنیا کی سب سے وفادار عورتیں جاپانی اور سب سے سختی روسی ہوتی ہیں۔ جاپانی تو خیر اس لیے وفادار ہیں کہ وہ اس قدر معروف ہوتی ہیں کہ ان کے پاس بے وفائی کرنے کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا۔ البتہ روسی عورتیں محنت کرنے کی اتنی عادی ہوتی ہیں کہ سرکاری دفتر میں انہیں بہت مشکل پیش آتی ہے، لیکن وہ روسی صدر نہیں بن سکتیں کیونکہ وہ اتنا بوجھ کھائیں سے لائیں گی۔

ہو سکتا ہے یہ بورس یلسن کو صدر بننے سے روکنے کے سلسلے کی کڑی ہو۔ دیے اس

ہم یہی سمجھتے رہے کہ صرف ہمارے ہاں ہی حکمران بننے کے لیے ”بچ“ چاہیے۔ ویسے تو عوام کے سرگٹنے کے لیے ہوتے ہیں اور حکمران کے سر ہالوں کے لیے، لیکن روس کے سنے سربراہ کا سر باہر سے بھی خالی ہوگا۔ ہمیں کشمیری رانی اور حکمرانی کا شوق نہیں کہ ان میں ڈوب مرنے کے بڑے مواقع ہیں۔ ہمارے نزدیک حکمران کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ حکمران ہوتا ہے۔ اس کا پہلا قانون رعایا سے اپنی حفاظت کرنا ہوتا ہے۔ حکمران اور الجبرا ہمیں کبھی سمجھ نہ آسکا۔ ہمیں تو کئی بار توڑک جھاگیر کی پڑھنے کے باوجود یہ سمجھ نہ آسکی کہ جھاگیر جس اونٹنی کا دودھ پیتا تھا اسے روز چار سیر گائے کا دودھ کیوں پلاتا تھا؟ خیر بادشاہوں کے کام کا مومن کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ ہم تو صدوری کو عرصہ تک صدر کا لباس سمجھتے تھے۔ اس سے اندازہ لگائیں ہم صدر کو کتنا سمجھتے ہیں۔

بہر حال اس تحقیق کے بعد روس میں کئی گمنے رہنماں اٹھانے لگے ہیں۔ لکھوں نے تو بچ کی وگس پہنا بھی شروع کر دی ہیں۔ اس سے قبل تو وہ بھی ہماری طرح اپنا بچ ٹوٹی اور نکیس سے چھپا کر رکھتے۔ البتہ نکسوں کو یہ فائدہ تھا کہ انہیں نکس کی نہ خریدنا پڑتی اور پال گرنے کا بھی ڈر نہ ہوتا۔ وہ شخص جس کے آگے بڑے بڑے سر جھکتے ہیں اسے حجام کہتے ہیں۔ جو اس کے آگے سر نہ جھکائے اسے گھنجا کہتے ہیں۔ ہم ”سر“ پرست قسم کے لوگ ہیں۔ کئی حجاموں کا برنس ہمارے سر پر چل رہا ہے۔ پھر بھی ہم سمجھتے ہیں، سمجھ مذہب کی بنیاد ہی کسی نے حجاموں سے تنگ آکر رکھی تھی۔ سمجھ ان مسائل سے بالاتر ہوتے ہیں۔ وہ اس قدر سر بلند ہوتے ہیں کہ ان کا سر ان کے بالوں سے بھی بلند ہو چکا ہوتا ہے۔ اس تحقیق سے پہلے ہمارا خیال تھا کہ پاکستانی بوڑھوں کی آخری آرام گاہ مسجد اور روسی بوڑھوں کی حکومت ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں تو دین اور بوڑھے خدا خدا کرنے کے لیے ہیں۔ وہاں لیڈر بوڑھے ہو جائیں تو انہیں ایوان صدر میں جن دیا جاتا ہے۔ گور باجوف جب پلٹ بیورو کے رکن بنے تو ساٹھ سال کے تھے۔ دوسرے ممبران کے حساب سے ان کی عمر اتنی کم تھی کہ سب انہیں بچہ سمجھ کر بولنے نہ دیتے۔ یہ وہی گور باجوف ہیں جنہیں جو جانی میں انڈو کے دور ان کسی نے پوچھا: ”شاوی شڈہ؟“ تو وہ بولے: ”جی نہیں۔ میرے ساتھ یہ بے نشان پیدا کئی ہے۔“ وہ تو خیر کبھی بوڑھے نہ ہوں گے کیونکہ ہر بوڑھا حال سے پندرہ سال بڑا ہے۔ برٹنیف جب صدر بنے



دیوارِ خواتین

امریکی محققین کے کیا کہنے 'انہوں نے دو سال قبل بڑی تحقیق کے بعد کہا تھا کہ کو لمبس مرد تھا۔ حالانکہ ہم نے شروع میں ہی کہہ دیا تھا کہ اگر کو لمبس مرد نہ ہوتا تو وہ امریکہ دریافت نہ کرتا۔ بلکہ وہ امریکہ دریافت کرتی۔ اس برس امریکیوں نے تحقیق کے بعد بتایا کہ صدر بئش جب اپنے دور حکومت میں تیسری دنیا کے ایک ملک کے دورے پر گئے تو اس ملک نے اکیس توپیں داغی تھیں اور اتفاق سے ایک بھی گولہ نشانے پر نہ لگا تھا۔ تحقیق کا جذبہ

تحقیق کے حساب سے تو بورس یلسن پیدا انٹی صدر ہیں، یعنی جب وہ پیدا ہوئے تو ان کے سر پر بال نہ تھے۔ بچپن میں انہیں ناخن کاٹنے کی عادت تھی، اب نہیں۔ کیونکہ انہوں نے سارے ناخن کاٹ لیے ہیں۔ روس وہ ملک ہے جہاں بندہ شراب پینے سے انکار کر دے تو دوسرا سمجھتا ہے، یہ نشتے میں ہے۔ یلسن اس حالت میں روس کی حکومت یوں چلا رہے ہیں جیسے دیگن چلا رہے ہوں۔ ماسکو کو اکثر بڑی بڑی پریشانیاں رہتی ہیں، جن میں سے ایک یہ جاننا ہے کہ اسے کون کون سی پریشانیاں ہیں۔ وہ افسانے جنہیں افسانہ نگار کی بجائے مورخ لکھتے ہیں، انہیں تاریخ کہتے ہیں۔ دنیا میں یلسن کے جتنے افسانے مشہور ہیں، اتنے کسی افسانہ نگار کے نہ ہوں گے۔ خواتین کے مسائل ”چٹکیوں“ میں حل کر دیتے ہیں۔ ہمارے خیال میں بورس یلسن کو اپنے علاوہ کسی اور کو صدارتی امیدوار سے کوئی خطرہ نہیں، لیکن اسے پھر بھی گنجلوں سے محتاط رہنا چاہیے کیونکہ گنجلوں کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔

ہے۔ آٹو موبائل اور آٹو بائو گرافی میں ذرا سی بے اعتدالی عمر بھر کا پیچھا تاراج جاتی ہے۔ خود نوشت کے بارے میں ہماری توہین رائے ہے کہ اس میں صرف ایک ہی خامی ہوئی ہے، وہ ہے ناقص موضوع کا انتخاب۔ سفر نامہ مصنف کی آپ جی کا قارئین ایڈیشن ہوتا ہے۔ اس میں وہ سب ہوتا ہے جو مصنف چاہتا ہے کہ کاش ہوا ہوتا۔ اگرچہ ان ساری خواہشوں کی تکمیل کے لیے آپ جی موجود ہے، لیکن اس میں یہ مسئلہ آجاتا ہے کہ مقامی جھوٹ جلد رنگ چھوڑ دیتے ہیں۔ اکثر سفر نامے ایسے ہوتے ہیں کہ اگر بندہ ان پر اعتبار کر لے تو پھر سفر نامہ نگار پر اعتبار نہیں رہتا۔ یوں قواب ایسا دور ہے کہ پہلے انسان دوسرے سے پوچھتا ہے: ”آپ بھوتوں پر یقین رکھتے ہیں؟“ اب جھوٹ دوسرے سے پوچھتا ہے: ”آپ انسانوں پر یقین رکھتے ہیں؟“ شکر ہے محققین نے یہ نہیں کہا کہ مارکوپولونے سفر نامہ لکھا ہی نہیں۔

ہمیں مارکوپولونے اور پولو پینڈ ہیں۔ پولو واحد گیم ہے جس میں بندہ کھیل کھیل کر بھی خود سے ہار سکتا ہے۔ مارکوپولونے سفر ناموں کو دیوار چین کے نہ ہونے سے مشکوک بنایا ہے۔ ہمارے سفر نامہ نگاروں کے سفر ناموں کو دیوار خواتین کے ہونے سے یوسف کبیل پوش سے یوسف جانی ٹی وی پوش تک کے سفر ناموں میں دیوار خواتین ملتی ہے، جس میں ملک سے نکلنے ہی مصنف چٹا جاتا ہے۔ گلتا ہے ہمارے سفر نامہ نگار جہاں جاتے ہیں، وہاں کے مردوں کو پہلے ہی پتہ چل جاتا ہے اور وہ کہیں اور چلے جاتے ہیں۔ اس لیے انہیں ہر طرف عورتیں ملتی ہیں۔ ہم جاتے ہیں۔ ایک مرد بیک وقت سینکڑوں لڑکیوں سے محبت کر سکتا ہے بشرطیکہ ان میں سے کوئی بھی اس میں دلچسپی نہ لے۔ شاعری میں عورتوں سے باتیں کرنا غزل اور نثر میں ان سے باتیں کرنا سفر نامہ کہلاتا ہے۔ ہمارے ہاں لوگوں کو سب سے زیادہ وہ سفر نامہ پسند آتا ہے جو مصنف کی بیوی کو پسند ہو۔ مقامی مارکوپولوس لیے بچے ہوتے ہیں کیونکہ ان کی کتابیں ریڈر پروف ہیں، بالخصوص امریکی محققوں سے۔ جیسے مرحوم عظیم قریشی صاحب نے اپنا شاعری کا مجموعہ پنڈت نہرو، دہرا دشا اور چرچل کو بھیجا تو انتظار حسین نے انتظار کیے بغیر کہا: ”پنڈت نہرو تو چلے ہوئے مگر برناڈشا اور چرچل تو شاید اردو نہیں جانتے۔“ تو عظیم قریشی بولے: ”اگر عظیم قریشی کے کلام کا انہیں مطالعہ کرنا ہے تو پھر ان دونوں کو اردو سیکھنا پڑے گی۔“

امریکیوں میں اس قدر ہے کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد سب سے پہلے اپنے سرکاری والد کو تحقیق و تحقیر کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ایک فرانسیسی رائٹر نے کہا: ”کسی امریکی کے پاس چند ماہ کے لیے کرنے کو کچھ نہ ہو تو وہ یہ وقت اس تحقیق میں لگا دے گا کہ اس کا دادا کون تھا۔“ یہ سن کر مارک ٹوئن بولے: ”اگر کسی فرانسیسی کے پاس اتنا وقت ہو تو وہ اسے دادا کی بجائے اپنے والد پر لگے گا۔“ بہر حال امریکیوں نے تازہ ترین انکشاف کیا ہے کہ مارکوپولو چین قبلائی خان کے دربار میں گیا ہی نہیں تھا بلکہ اس نے گھر بیٹھ کر یہ سفر نامے لکھے تھے۔ اس انکشاف کے بعد ہمیں لگا کہ کہیں وہ یہ نہ کہہ دیں کہ مارکوپولو پاکستانی سفر نامہ نگار تھا لیکن انہوں نے وجہ یہ بتائی کہ اس نے اپنے سفر نامے میں چائے، دیوار چین اور غریبی کا ذکر نہیں کیا۔ مارکوپولونے چائے کا شاید اس لیے ذکر نہ کیا ہو کہ اسے کسی پسند ہو اور دیوار چین کا ذکر اس لیے نہ کیا ہو کہ وہ سفر نامے میں صرف بڑی بڑی چیزوں کا ذکر کرنا چاہتا ہو۔ اسے وہاں غریبی نظر نہ آنے کی وجہ البتہ طبی ہے کہ ان دنوں نظری کی بینکین دستیاب نہ تھیں۔ ہمارے ہاں تحقیق بھی یوں کرتے ہیں جیسے تفتیش کر رہے ہوں۔ اب تو کچھ حضرات لوگ اس پر تحقیق کر رہے ہیں کہ ادبی ڈاکٹروں میں سے کس کس نے خود تحقیق کر کے ڈاکٹریت کی۔ ایک محقق نے بتایا کہ ساغر صدیقی صاحب کو پانی بہا گیا لگتا تھا۔ سو وہ ٹوٹی بند کر کے نہاتے تھے۔ پروفیسر حافظ آبادی صاحب نے اپنی تحقیق سے ثابت کیا کہ پروفیسر حضرات غیر حاضر داغ ہوتے ہیں کیونکہ موصوف خود تحقیق کرتے کرتے اس بات کو میسر بھول گئے کہ وہ کس موضوع پر تحقیق کر رہے ہیں۔ مغربی محققوں نے تو کھال کھال کر شیکسپیر کو کنگال کر دیا۔ اب تو انہیں شیکسپیر کی کوئی کہانی ایسی ملے گی انہیں پہلے کسی مصنف کی کتاب میں ملی ہو تو وہ نہایت دلجمعی سے تحقیقات جاری رکھتے ہیں، کیونکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ ایک نہ ایک دن اصل کہانی مل جائے گی۔ ہمارے ایک مزاح نگار دوست بولے: ”مرنے کے بعد میں جنت میں شیکسپیر سے یہ ضرور پوچھوں گا کہ اس کے نام سے جو ڈرامے منسوب ہیں، عام خیال ہے کہ وہ اس نے نہیں لکھے۔“ عرض کیا: ”اگر شیکسپیر جنت میں نہ ہوا تو؟“ بولے: ”پھر کھاد خود ہی اس سے پوچھ لیں گے۔“ ڈیپلومت اور محقق کو دھوکا دینا آسان ہے۔ آپ اسے سچ سچ بتا دیں، وہ سمجھے گا آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ سب سچ لکھ دینا تو محقق کی روزی پر لات مارنا

جوتے خریدے ہیں۔ اگر باجپائی وزیر اعظم نہ رہے تو ان جو توں کا کیا مصرف رہ جائے گا۔ ہم تو چاہتے ہیں باجپائی حکومت اور جو اہر سنگھ کے جوتے کئی سال چلیں۔

سیاست اور جو توں کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ ایک بار ابن انشاء بازار میں جوتے خریدنے گئے۔ جوتے پسند آگئے مگر کہا: ”کم کے بعد خریدوں گا۔“ تو دکاندار بولا: ”کم کے بعد نہیں ملیں گے کیونکہ کم سے سیاسی سرگرمیوں سے پابندی اٹھانی جا رہی ہے۔“ جو اہر سنگھ نے 30 سال قبل اٹل بھاری باجپائی کے لیے جوتے اتارے تھے، تب سے ان کے نعلین در بخلین ہیں۔ اسے سنگھے پاؤں دیکھ کر دوسری پارٹیوں کے کارکن جوتے اتار لیتے ہیں۔ جوتا بھارت میں پہننے کے علاوہ بھی کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ غالب سے کسی نے پوچھا: ”جوتا دکر ہے یا مونٹ؟“ تو غالب نے کہا: ”اگر زور سے لگے تو دکر، اگر آہستہ لگے تو مونٹ۔“ ویسے اگر جوتے مونٹ ہوتے تو اٹل بھاری باجپائی خود بھی سنگھے پاؤں ہی ہوتے۔ سنا ہے ان کے جوتے بہت چلتے ہیں جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ ابھی کنوارے ہیں اور کنواروں کے جوتے صرف پہننے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ شادی انہوں نے ابھی تک شاید اس لیے نہیں کی کہ وہ کوئی کام جلد بازی میں نہیں کرتے، سوچ سمجھ کر کرتے ہیں اور جو شادی نہیں کرتے، وہ یہ سوچ سمجھ کر ہی کرتے ہیں۔ سارے خاندان اور سیاست دان ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں اٹل بھی یہ خوبی ہے کہ ایک الودیکھ لو تو سمجھ لو سب دیکھ لیے۔ سیاستدانوں میں اس کے علاوہ اور بھی کوئی خوبیاں ہوتی ہیں۔ جتنا دل کے صدر اور سیاست بھار کے وزیر اعظم لاو پر شادیوں نے کہا ہے ”ہم اٹل بھاری باجپائی کے مقابلے میں بہتر وزیر اعظم نہیں ہو سکتے“ کیونکہ ہم شادی شدہ ہیں اور وہ غیر شادی شدہ۔“ حالانکہ ہم سمجھتے ہیں شادی شدہ زیادہ ذمہ دار ہوتے ہیں جیسے آصف زرداری صاحب میں ساری اچھے خاندانوں والی خوبیاں ہیں، یعنی کھانا بہت اچھا پکاتے ہیں، سنتے بھی بہت اچھا ہیں، برتن تو اتنے صاف دھوتے ہیں کہ بھارتی پریس انہیں مسٹر کلین کے نام سے یاد کرتا ہے۔ فرائیڈ سے کسی نے پوچھا: ”دنیائیں کتنے فیصد خواتین اور مرد شادی کے خواہش مند ہیں؟“ فرائیڈ نے کہا: ”ننانوے فیصد۔“ پوچھنے والے نے کہا: ”اور ایک فیصد؟“ فرائیڈ بولا: ”جموٹ بولتے ہیں۔“ ویسے کنواروں کو بھی حکومت ملتی ہے تو وہ بھی اس کے ساتھ جو سلوک کرتے ہیں اس سے شادی شدہ ہی لگتے ہیں۔ ایک



نعلین، در بخلین

یہ جانتے ہوئے بھی کہ بھاری باجپائی دراصل باری باجپائی ہے، پھر بھی ہمارا دل چاہتا ہے وہ کسی طرح اتحاد کا ووٹ لے ہی لیں۔ چاہے باجپائی، بیاجپائی ہو جائے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمیں باجپائی سے کوئی ہمدردی ہے بلکہ ہمیں تو بھارتی چھاپاری کے 64 سالہ رکن جو اہر سنگھ سے ہمدردی ہے جس نے تیس سال قبل قلم کھائی تھی کہ اس وقت تک سنگھے پاؤں رہے گا جب تک باجپائی ملک کے وزیر اعظم نہیں بن جاتے اور جو اہر سنگھ نے ابھی کل ہی

زریسار اونے شائع کی کیونکہ کسی شاعر کو مارنا تو اس کا مجموعہ کلام شائع کر دو۔ اگر شاعر پھر بھی زندہ رہا تو پھر اس کا مرنا مشکل ہو گا۔ نوابزادہ نصر اللہ خان کی طرح انہیں شاعر کہا جائے تو برا نہیں مناتے کیونکہ سیاست دان اپنے بارے میں صرف اس الزام پر ابرامانتے ہیں جس میں صداقت ہو۔

پتہ چلا ہے جو اہر گھگھ کے جوتے کاٹنے ہیں لیکن وہ پھر بھی انہیں خوشی سے پہنتا ہے۔ جہاں تک جوتوں کے کاٹنے کی بات ہے تو اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ یہ جوتے بی جے پی کے کسی لیڈر نے دان کیے ہوں گے لیکن جو اہر گھگھ اس پر بھی خوش ہے۔ شاید اس لیے کہ جگ جوتے دنیا کی بڑی نعمت ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے آپ کو کسی اور بڑی سے بڑی تکلیف کا احساس نہیں ہوتا۔ لیکن ہمیں ڈر ہے کہ اگر باجپاتی اعتماد کا دوٹ نہ لے سکے تو بہت سے ”جو اہر دوں“ کو جوتے نہ اتارنا پڑیں اور ہمیں لکھنا پڑے۔

بی جے پی آر ہی ہے نئے پاؤں
جی میں آتا ہے کہ بڑھ کے دوں جوتا

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

بندہ جس کی جب تک شادی نہ ہو، وہ خود کو کنوارہ کہتا ہے۔ شادی کے بعد وہ خود کو جو جو کہتا ہے، وہ سننے سے تعلق رکھتا ہے۔ اداکار اکیس تو فن سے شادی کر لیتی ہیں، جس کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ طلاق کی صورت میں بچے لینے کے لیے عدالت میں جانا نہیں پڑتا۔ باجپاتی کو سیاست سے شادی کرنے کا یہ فائدہ ہو کہ آج بی جے پی امید سے ہے۔ کہتے ہیں باجپاتی کے وزیر اعظم بننے کی دکانوں سے جوتے غائب ہو گئے ہیں۔ آئزن ہاورب امریکہ کا صدر منتخب ہوا تو اسے ملک بھر سے بے شمار تحفے موصول ہوئے، ان میں ایک حمازو بھی تھی۔ بھیجنے والے نے ایک رقم بھی ساتھ بھیجا تھا، جس میں لکھا تھا: ”آپ نے اپنی تقریروں میں ملک کا گندمکانے کا وعدہ کیا تھا۔ مجھے یقین ہے میرا یہ تحفہ آپ کو اپنے وعدے کی یاد دلاتا رہے گا۔“ لوگ آج کل جو اہر گھگھ کے پاؤں میں جوتا دیکھ کر اندازہ لگاتے ہیں کہ باجپاتی ابھی تک بھارت کے وزیر اعظم ہیں۔ ایک دن جو اہر گھگھ نے تھوڑی دیر کے لیے جوتا اتار ا تو لوگ یوں گھبرا گئے جیسے وزیر اعظم اتار دیا ہے۔ جب رام کو بن باس مالتو اس کے بھائی نے بھی رام کے پاؤں سے جوتے اتار والے تھے تاکہ جب بھائی کی یاد آئے تو انہیں دیکھ کر آنکھیں غنڈی کر لیا کرے۔ بھارت کی دوسری پارٹیوں کے کارکن بھی اپنی پسند کی لیڈر کی آؤ بھگت کے لیے احتراماً جوتا اتار لیتے ہیں۔ لیڈرنا پسند ہو تب بھی اس کے ساتھ ایسا ہی کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں کچھ لوگ اسے تنگ ہیں کہ وہ جوتے تک لینے کے لیے مسجد جاتے ہیں۔ بی جے پی کی وجہ سے بھارتی مسلمانوں کے گوھر بھی مسجدیں لگتے ہیں، یعنی ساز و سامان سے خالی۔ باجپاتی صاحب پارٹی میں تنگزم میں تقریر کرنے سے پہلے جوتے اتار لیتے ہیں۔ ایسے مقرر ہیں کہ ایک بار تقریر کے دوران ناگیر و فون خراب ہوا تو انہوں نے آواز بلند کرتے ہوئے آخری قطار میں بیٹھے ایک شخص سے دریافت کیا: ”کیا میری آواز سن سکتے ہو؟“ اس شخص نے جواب دیا: ”نہیں۔“ تو فوراً پہلی قطار میں بیٹھے ایک شخص نے اٹھ کر کہا: ”میں اچھی طرح سن سکتا ہوں۔ آپ یہاں آجائیں۔ میں آپ کی جگہ بیٹھ جاتا ہوں۔“

اہل بھاری باجپاتی شاعر بھی ہیں۔ وہ اس قسم کی شاعری کرتے ہیں جیسی اس قسم کے لوگ کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ پوچھیں اس قسم کے لوگ کیسی شاعری کرتے ہیں؟ تو صاحب بھی اہل بھاری باجپاتی کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کی کتاب ان کے سیاسی حریف

صدر اور وزیر اعظم کون کون رہے ہیں؟ رگھیا بڑا وسیع صورت اداکار ہے۔ جولائی میں ایک بار اسے ایک لڑکی پسند آئی تو اس کے باپ کے پاس یہ کہنے گیا کہ اپنی لڑکی کی مجھ سے شادی کر دیں۔ اس دوران گھبراہٹ پر قابو پانے کے لیے مسلسل منہ کھول کر مسکرا رہا تھا کہ اس کے متوقع سر نے اس کی حالت دیکھ کر کہا: ”اپنا منہ بند رکھو تاکہ میں دیکھ تو سکوں کہ تم کون ہو؟“ اس کی تو چال بھی ایسی ہے کہ دو ٹانگوں پر بھی چل رہا ہو تو یہ نہیں لگتا کہ صرف دو ٹانگوں پر چل رہا ہے۔ 1992ء میں لاہور کے ایک گز لڑکچ میں مباحثہ ہوا: ”آج دے سیاست دانان نالوں رگھیا چنگ۔“ مگر لڑکچ میں جس سوال کا جواب چارے زیادہ لڑکیوں کا ایک دوسرے سے ملتا ہوا ہے نصابی سوال کہتے ہیں لیکن تمام لڑکیوں نے رگھیا کو سیاست دانوں سے بہتر قرار دیا تھا۔ جس پر رگھیا نے برا بھی منایا تھا لیکن مسرت شاہین نے خود ہی خود کو سیاست دانوں سے مکمل بہتر قرار دے دیا ہے۔ چلو اگر نصف بہتر کہتی تو خلیفہ کچھ سیاست دان مان ہی جاتے۔

اداکاری اور سیاست کا تب سے چلی دامن کا ساتھ ہے جب ابھی اداکاراؤں کی چولی اور سیاست دانوں کا دامن سلامت تھا۔ ترکی کہاوت ہے: ”مگر بے عیب دوست چاہتے ہو تو دوست کے عیب نہ دیکھو۔“ یہی امتیاز آپ کو بے عیب سیاست دان ڈھونڈنے کے لیے کرنا ہوگی۔ آج کل تو اداکاری اور سیاست کا اتنا گہرا تعلق ہے جتنا اداکاراؤں اور سیاستدانوں کا۔ ہماری ٹریجڈی یہ ہے کہ ہمارے پاس جتنے زندہ ہیر و جیں سب کا تعلق فلم سے ہے۔ ہم نے تو پہلی بار جب میکوڈر وڈ پر بارہ کے پوسٹروں کے ساتھ نواز شریف کے رنگین تصویر کی پوسٹر دیکھے تھے، تو ہمیں پاکستان کے مستقبل کے زیادہ فلم انڈسٹری کا مستقبل تاننا لگتا تھا۔ یہی نہیں ہماری بیشتر سیاسی خواتین نے جتنی شہرت حاصل کی وہ خواتین کو فلموں کے ذریعے ہی مل سکتی ہے۔ ہمارے ہاں حقیقت فلمی کہانی کے بڑے قریب ہے جس سے لگتا ہے زن زور اور زبان فساد کی جڑ ہے۔

سیاست دانوں اور اداکاراؤں کے بارے میں اخبارات جو مرضی چھاپیں وہ اس کا برا نہیں مناتے جب تک کہ وہ سچ نہ ہو۔ دو فلمی ستاروں کے سکرٹری بیٹھے ایک فلم کا پریسٹر شو دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک اس فلم میں کام کرنے والی ہیر و جین کا اور دوسرا اس فلم کے



ملکہ افسانہ

جب سے ہم نے مسرت شاہین کا یہ بیان پڑھا ہے کہ نواز شریف چار دن کا ہیر و جے جب کے بے نظیر کی وزارت عظمیٰ چند روزہ ہے مگر میں سدا بہار ہیر و جین ہوں تب سے ہمیں لگ رہا ہے کہ یا تو وہ نواز شریف اور بے نظیر کو نہیں جانتی یا پھر جانتی ہے۔ اس سے قبل رگھیا نے کہا تھا کہ میں چاہوں تو صدر اور وزیر اعظم میں سکتا ہوں، لیکن صدر اور وزیر اعظم میں بھی تو رگھیا نہیں ہو سکتے۔ اگرچہ اس بیان سے یہی لگتا ہے کہ رگھیا کو پتہ ہی نہیں ہمارے

ہیر وکاسیکر ٹری تھا۔ سکرین پر دونوں کی اچھل کود دیکھ کر ایک سیکرٹری نے دوسرے سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا: ”دیکھ رہے ہو ناں! اداکاری انہیں آتی نہیں، لیکن دونوں ہماری آمدنی کا اسی فیصد بھجیایا لیتے ہیں۔“ ہمیں بھی اس سبکی کی کارروائی دیکھ کر یہی لگتا ہے۔ ہمیں ایک سیاستدان نے بتایا، رات کو میں نے ایک ڈرائیو خواب دیکھا جو یوں تھا کہ وہ جو رقم خرچ کر رہا تھا، وہ اس کی اپنی تھی۔

ہیر وکاسیکر ڈکسٹری میں آدھا ہوتا ہے۔ واقعی ہیر و انسان آدھا ہی ہوتا ہے۔ ہیر وکاسیکر ڈکسٹری میں ملکہ افسانہ ہے۔ اس حساب سے تو ہیر وکاسیکر صرف مسرت شاہین ہی ہے کہ جتنے افسانے اس کے مشہور ہیں، اتنے تو بشری، رخن کے نہ ہوں گے۔ دیے بھی ادب میں جن خواتین کے افسانے مشہور ہوئے ہیں، ان میں سے بیشتر شاعرات ہیں، پھر مسرت شاہین کو تو بچپن سے ہی ہیر وکاسیکر بننے کا شوق تھا۔ اس کے ننھے بچے نے کہا تھا: ”اگر یہ پانچ سال کی عمر تک ”نابالغ“ نہ ہوئی تو پھر کبھی ”نابالغ“ نہ ہوگی۔“ وہ گھر میں ایکٹریس بننے کی ریرسل کیا کرتی۔ پوچھا: ”سب سے پہلے کیا سیکھا؟“ بولی: ”یہ کہ منج گیارہ بجے تک سوتا ہے؟“ وہ حیرت انگیز اداکارہ ہے اور حیرت انگیز چہرہ کے بارے میں ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ انہیں دیکھ کر نئی نسل کو بالکل حیرت نہیں ہوتی۔ رقص کر رہی ہو تو لگتا ہے کہ کوئی شاہین مسرت کا اظہار کر رہا ہو۔ وہ ایک آنکھ سے اتنا دیکھ لیتی ہے جتنا دیکھنے کے لیے آنکھیں چار ہونا چاہئیں۔ اپنی کامیابیوں پر تو کبھی فخر محسوس کرتے ہیں، ٹاکامیوں پر فخر کرتے ہم نے اسے اور جنرل حمید گل کو ہی دیکھا ہے۔ اس سے انج پوچھو تو کہے گی: ”انا مک انج۔“

ہیر وکاسیکر میں ہیر و یا فلم میں۔ اس کے خیالات سے کہیں زیادہ لباس سے پتہ چلتا ہے، وہ کس زمانے کی ہے۔ کہتے ہیں عورتیں خاندان کو خوش رکھنے کے لیے نئے لباس زیب تن کر لیتی ہیں۔ حالانکہ اگر شوہروں کو خوش کرنا مقصود ہو تا تو وہ اپنا ایک ایک لباس کئی کئی سال پہنتیں۔ فلموں میں مسرت شاہین کے لباس دیکھ کر زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ پہنتی ہے۔ فلموں اور تاریخ میں ہیر وکاسیکر کا کام محبت کرنا ہی رہا ہے۔ فلمی ہیر وکاسیکر تو یہ گھر سے سیکھ کر آتی ہے جب کہ تاریخی ہیر وکاسیکر یہ مورخ سکھاتا ہے۔ برطانیہ میں تو

1994ء میں لوسٹریز کے نام سے یونیورسٹی نے تین سالہ کورس شروع کیا ہے۔ ہزاروں طلبہ و طالبات نے اس میں داخلے کے لیے درخواستیں دیں، لیکن پچھلے سال تک صرف چند لڑکے لڑکیاں باقی بچے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ لوسٹریز کا تین سالہ کورس صرف تھیوری پر مشتمل تھا، پریکٹیکل ایک بھی نہ تھا۔

ہم یہ تو نہیں کہتے کہ مسرت شاہین سدا بہار ہیر وکاسیکر نہیں ہے۔ وہ خود کو سدا بہار ہیر و کہتی تو بھی مان لیتے لیکن اتنا یہ ہے کہ ہیر وکاسیکر کو ایکٹنگ نہ آتی ہو تو فلم انڈسٹری میں ”چل“ جاتی ہے۔ جیسے ایک صاحب نے کہا: ”میں کئی گھنٹے پانی میں رہ سکتا ہوں کیونکہ مجھے تیرنا آتا ہے۔“ تو دوسرا بولا: ”میں کئی سال پانی میں رہ سکتا ہوں کیونکہ مجھے تیرنا نہیں آتا۔“ لیکن اگر آپ کو ایکٹنگ نہ آتی ہو تو آپ سیاست میں نہیں چل سکتے۔

برادری میں شامل کرتے ہیں کہ شاعر لٹنے پر غزلیں لکھتے ہیں تو پولیس والے نہیں۔ اگرچہ فی زمانہ سب سے قیمتی راسٹر ڈاکٹر ہے جو ایک دو سطریں لکھنے کا اتنا معاوضہ لیتا ہے، جتنا منٹو صاحب کو دو کتابیں لکھنے پر بھی نہ ملتا تھا۔ کم لفظوں میں بڑی بات کہنا زیادہ لفظوں میں چھوٹی بات کہنے سے آسان ہے۔ سو ہمارے لیے غزل کی نسبت خط لکھنا زیادہ مشکل ہے۔

دلیر تو ایسے بھی آرٹ کا نمونہ ہوتے ہیں کہ انہیں شروع کرنے سے پہلے بندے کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ اسے کیا لکھنا ہے۔ جب وہ لکھ رہا ہوتا ہے اسے کچھ پتہ نہیں ہوتا کیا لکھ رہا ہے اور جب ختم کرتا ہے تو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ کیا لکھا ہے۔ اس حساب سے تو ہمیں قارئین کے لو بھڑکنے ہی رہتے ہیں جو اکثر لا جواب ہوتے ہیں اور لا..... جواب ہی رہتے ہیں۔ کچھ کے خیال میں خم خواتین پر بہت لکھتے ہیں، حالانکہ ہم ان کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم خواتین پر نہیں لکھتے، بیش کاغذ پر لکھتے ہیں۔ ایک بار ناٹمز کے ہنری لوئیس کو خط ملا: ”مسٹر لوئیس! میری بڑی جھ سے ناراض ہو کر گھر چھوڑ کر جا رہی تھی۔ پھر آپ کے ٹیکسٹ میں طلاق کا مضمرات پر کبھی ثوری پڑی اور اس نے ارادہ بدل دیا۔ سو اس بھنے سے آپ مجھے اپنا پرچہ بھیجنا بند کر دیں۔“

اٹھتے ہیں ہمیں ایک بیورو کریٹ کا اشتہاری خط ملا۔ ہم تو خطرہ کو بھی خط رہ سمجھتے ہیں مگر درو کریٹ اور الجبرا ہمیں کبھی سمجھ نہیں آ سکا۔ ہم سے بہتر تو روسی چر دیا تھا جسے ایک کوہ بانی کا شوقین بیورو کریٹ ملا۔ بیورو کریٹ نے ایک نظر چر دیا ہے کا بھیڑ کا غلہ دیکھا اور دیا ہے کہ کہا کہ اگر میں بتا دوں کہ یہ یہ کل کتنی ہیں تو ایک مجھے دے دو گے۔ چر دیا ہاں گیا۔

درو کریٹ نے اندازہ لگا کر کہا: ”287“ چر دیا بہت حیران ہوا۔ بیورو کریٹ نے ایک بکری نا اور اسے کاندھے پر ڈال کر جانے لگا تو چر دیا ہے کہ ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس نے کہا: کر میں بتا دوں کہ تم کس پر وفیشن سے ہو تو تم میری بھیڑ واہیں کر دو گے؟“ بیورو کریٹ ران ہوا لیکن اس نے سوچا یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ میرا پر وفیشن بتا دے۔ سو اس نے شرط تو چر دیا ہے کہ: ”تم ایک بیورو کریٹ ہو۔“ حیرانی سے بیورو کریٹ نے پوچھا: ”آپ کیسے پتہ چلا؟“ تو چر دیا ہوا: ”پہلے کاندھے سے کتابتاریں، پھر بتاتا ہوں۔“ ہر حال سارے رو کریٹ برے نہیں ہوتے کچھ بہتر برے بھی ہوتے ہیں۔ خط لکھنے والے بیورو کریٹ درو ددل رکھنے والوں کے لیے ایک اشتہار لکھ بھیجا ہے۔ اگرچہ درو ددل رکھنا اس زمانے



مسماۃ قومی یک جہتی

خط اردو کی وہ صنف خن ہے جس کی پہلے دن ہی نیک کاری کر دی گئی تھی۔ آج بھی بہترین خط وہ مانا جاتا ہے جسے پڑھ کر پھاڑ دیا جائے۔ زمانہ بدل گیا ہے۔ اب تو شاعری میں بھی حسیوں کے خطوط سے مراد ان کے خدو خال ہی لیے جاتے ہیں۔ نئی نسل تو خطوط غالب لینے بھی ڈاک خانے جاتی ہے۔ ہم نے خود اس لیے خطوط غالب نہیں پڑھے کہ کسی کے خط پڑھنا غیر اخلاقی حرکت ہے۔ ہر حال ہم خط لکھنے والوں کو راسٹر مانتے ہیں۔ ہم تو پولیس کو بھی راسٹر

میں میڈیکل پرائلیم ہے، کوئی خوبی نہیں۔ بہر حال اشتہار یہ ہے۔ ”مسماۃ قومی جیکبٹی عرصہ سے لاپتہ ہے۔ اس کی عمر 49 سال ہے۔ گزشتہ کئی برسوں سے لسانی، مذہبی اور گروہی فسادات میں ہوش و حواس کھو بیٹھی ہے۔ اگر کسی کو ملے تو وہ اسے کابینہ کے اجلاس میں پہنچا دے۔“

مسماۃ ہونا اتنا پیچیدہ عمل ہے کہ کوئی عورت ہی اس سے عہدہ برآ ہو سکی ہے۔ باقی ہوش و حواس کھونے والی مسماۃ کو کابینہ کے اجلاس میں پہنچانے کی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ کیونکہ پہلے ایسے مریضوں کو سینٹل ہسپتال میں پہنچایا جاتا تھا، لیکن اس کیس میں ہم رائے نہیں دے سکتے کیونکہ ہم کبھی کابینہ کے اجلاس میں نہیں گئے۔ البتہ اخباری رپورٹیں پڑھ کر لگتا ہے کہ پہلے بھی مسماۃ جیسی حالت والے لوگ وہاں ریفر کیے جاتے ہیں۔

عورتیں پیدا انہیں ہوتی ہیں انہیں عورتیں بنایا جاتا ہے۔ مسماۃ قومی جیکبٹی کو سمات شاید اس لیے کہتے ہیں کہ سیاست دانوں نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو سمات کے ساتھ کرتے ہیں۔ ہم نے کتابوں کی ایک دکان سے پوچھا: ”مسماۃ قومی جیکبٹی کا علم ہے؟“ سٹلر مین بولا: ”جناب اس طرف چلے جائیں، فکشن کی کتابیں اس طرف ہیں۔“ ایک فلم ساز سے پوچھا تو وہ بولا: ”اس پر میں فلم بنارہا ہوں۔ اتنی گرم فلم ہے کہ سردیوں میں شوٹنگ شروع کروں گا۔ اتنی فائیں ہیں کہ آپ اسمبلی کو بھول جائیں گے۔“ وہ کتاب جس میں سب سے زیادہ بڑے آدمیوں کا ذکر ہے، وہ بے ٹیل فون ڈائریکٹری۔ اس میں بھی ہمیں مسماۃ کا کوئی ذکر نہیں ملا۔ آخری بار اسے قائد اعظم محمد علی جناح صاحب کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ مسماۃ عرصہ سے خوف زدہ رہتی تھی۔ اتنا باندہ خوف زدہ کبھی نہیں ہوتا، محتاج ہوتا ہے جب اسے یقین ہو کہ وہ حق پر ہے۔ دیسے اگر یہ کیس پولیس کو دے دیا جاتا تو اب تک کئی قومی یک جہتیں برآمد ہو چکی ہوتیں۔ جہاں تک فسادات کے اس پرائمر انداز ہونے کی بات ہے تو یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک دکاندار سے گاہک نے کہا: ”آپ سے جو بات لایا، وہ چند دنوں میں ہی ٹوٹ گیا۔“ تو دکاندار بولا: ”آپ نے پتہ لیا ہو گا۔“ سو صاحب اگر فسادات ہی نہ ہوں تو پھر اتنی لسانی، مذہبی اور گروہی تنظیموں کا کیا استعمال رہ جائے گا۔ دنیا میں جو کچھ جہاں کہیں بھی ہو رہا ہے، کرہی اور کرہی کے لیے ہو رہا ہے۔ جو کچھ نہیں ہو رہا ہے، وہ بھی اس دے سے نہیں ہو رہا۔ جو شخص وقت کی قدر نہیں کرتا، وہ شخص اپنی قدر نہیں کرتا۔ بیوروکریٹ تو اکثر سست ہوتے

ہیں۔ سستی تھکاوٹ سے پہلے آرام کو کہتے ہیں۔ بہر حال اس بیوروکریٹ نے اگر مسماۃ کی تلاش کا بیڑہ اٹھایا ہے تو ہم پر امید ہیں۔ اگرچہ وہ کتاب جس میں ہمیں ہمیشہ امید ملی، وہ دشمنی ہی ہے۔ پھر بھی محترمہ بے نظیر بھٹو کے ہوتے ہوئے حکومت کسی وقت بھی امید سے ہو سکتی ہے۔ ایک جاپانی کہانی ہے۔ آدمی رات کو ایک جاپانی لڑکا محن میں ایک لمبا ناس تھامے کھڑا تھا۔ باپ نے اسے دیکھا تو پوچھا: ”تم کیا کر رہے ہو؟“ بولا: ”آسمان سے چند ستارے تو ڈانا چاہتا ہوں۔“ ”تاکمکن۔“ باپ نے کہا: ”البتہ چھت پر چڑھ کر کوشش کرو تو شاید ممکن ہو جائے۔“ لیکن یہاں یہ مسئلہ ہے کہ ہمیں پتہ نہیں مسماۃ قومی جیکبٹی کون سی قوم سے ہے۔ ابن انشاء نے شاید اسی بارے میں لکھا تھا۔

”ایران میں کون رہتا ہے؟“

”ایران میں ایرانی قوم رہتی ہے۔“

”فرانس میں کون رہتا ہے؟“

”فرانس میں فرانسیسی قوم رہتی ہے۔“

”یہ کون سا ملک ہے؟“

”یہ پاکستان ہے۔“

”اس میں پاکستانی قوم رہتی ہوگی؟“

”نہیں۔ اس میں پاکستانی قوم نہیں رہتی۔“

”اس میں سندھی قوم رہتی ہے۔“

”اس میں پنجابی قوم رہتی ہے۔“

”اس میں یہ قوم رہتی ہے۔“

”اس میں وہ قوم رہتی ہے۔“

ٹی۔ اسے فیصلہ کرنا تھا کہ وہ یہ رقم بیواؤں کے سلائی سکول کو دے یا قیصوں کے اوارے کو۔ سو اس نے بڑی سوچ بچار کے بعد ساری رقم جیل کی حالت سدھارنے پر لگا دی۔ کسی نے وجہ پوچھی تو بولا: ”مجھے کبھی بیواؤں کے سکول داخلے کی ضرورت تو پڑے گی نہیں، پھر یتیم خانے میں بھی مستقبل میں رہنے کا امکان نہیں۔ حکومت بدلے گی تو جیل آنا جانا رہے گا، سو کیوں نہ جیل کی حالت سدھاری جائے۔“ ہم نے جیل سے نکلنے کسی کو بہتر بننے تو نہیں دیکھا، لیڈر بننے دیکھا ہے۔ کہتے ہیں ”جیلیں لوگوں کو بندہ بنانے کے لیے ہیں۔“ اس حساب سے تو چند سالوں میں سنتری اور سیاست دان بھی بندے بن جائیں گے۔ ویسے ابھی تک سنتری اور سنترے میں قدر مشترک ”چھلا“ ہی ہے۔ ہمیں کسی کو بندہ بنانا تو نہیں آتا، البتہ بندہ بنانے کا طریقہ معلوم ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس کی تعریف کریں۔ ہم شیخ رشید صاحب کی تعریف تو نہیں کریں گے کیونکہ وہ ہمیں پسند ہیں۔ اتنا ضرور کہیں گے کہ فرزند جیل شیخ رشید جو پہلے جیل بدلے میں مشہور تھے، اب جیل نے انہیں بدل دیا ہے۔ اس بار جیل سے رہا ہوتے وقت وہ اپنا سامان اور غصہ وہیں چھوڑ آئے ہیں۔ لوگوں کو اس پر غصہ آرہا ہے کہ انہیں غصہ کیوں نہیں آ رہا۔ شیخ صاحب جب بارش لاء کی قید سے نکلے تھے تو ان کا وزن چار کلو بڑھا تھا۔ جمہوریت کی قید نے ان کا اتنا ہی وزن کم کیا ہے۔ ہم ایک وقت میں صرف ایک چیز سے ڈرتے ہیں تاکہ پتہ تو چل سکے کہ ہم کس سے ڈر رہے ہیں۔ شیخ رشید صاحب خدا اور شادی کے علاوہ کسی سے نہ ڈرتے تھے۔ لیکن جیل سے رہا ہو کر شادی کا ارادہ ظاہر کرنے لگے ہیں۔ شادی اور شاعری کے متعلق سوچنے کے لیے جیل سے بہتر کوئی جگہ نہیں، لیکن ایک فلسفی کے بقول اس بات کا فیصلہ کرنے کے لیے کہ ایک آدمی کو شادی کرنا چاہیے یا نہیں، پوری عمر درکار ہے۔ ایک سیاح نے ہالی وڈ میں شادی کی تقریب دیکھ کر گائیڈ سے پوچھا: ”یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟“ ”طلاق شمس شرماعت۔“ گائیڈ نے جواب دیا۔ ہمیں تو لگتا ہے شیخ رشید صاحب نے رہا ہو کر جیل جانے کی شروعات کی ہیں۔ ویسے بھی شیخ صاحب جیل سے نکلنے ہیں تو قیدی جتنے پریشان اور دکھی ہو جاتے ہیں، اتنے تو اداں حیل والے شیخ صاحب کے گرفتار ہونے پر نہ ہوتے ہوں گے۔

سیاست دان جیلوں میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ وہاں چور ڈاکو بھی بندہ ہوتے ہیں۔ اس



فرزندِ جیل

ہمارا مقولہ ہے کہ اگر بندے کو موقع ملے تو زندگی میں ایک بار باہر اور ایک بار اندر ضرور جانا چاہیے۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ بیرون ملک اور جیل جانے والوں کو ہمارا یہ مقولہ معقول نہیں لگا۔ بچپن میں سمجھتے تھے، سورج کا کس کے علاوہ کوئی فائدہ نہیں کہ اس کی وجہ سے گرمیوں کی چھٹیاں ہوتی ہیں۔ ایسے ہی جیل کا بھی فائدہ ہے کہ وہاں چوریاں ڈاکے اور انکیشن نہیں ہوتے۔ سابقہ حکومت کے ایک وزیر کو فلاجی کاموں کے لیے رقم

لیے انہیں تنہائی کا احساس نہیں ہوتا۔ اگرچہ جیل میں کبھی کبھی دنگانہ اور گالی گلوچ ہو تا رہتا ہے، پھر بھی سیاستدانوں کو اسبیلی کی یاد ستانی رہتی ہے۔ اسبیلی وہ جگہ ہے جہاں ہر بندہ دوسرے کو سیاست دان اور خود کو دیانت دار سمجھتا ہے۔ اگرچہ ہیرا ہیرے کو ٹوہا لوہے کو اور انسان کو انسان کاٹا ہے، لیکن ہم نے کبھی یہ نہیں سنا کہ کسی سیاست دان یا جاگیردار کے گھر ڈاکہ پڑا ہے۔ اسے کہتے ہیں پرو فیشنل کر سٹی۔ ایک مزاح نگار نے کہا تھا مجھے کانے سے عشق ہے۔ اس لیے میں ٹی وی پر دوستی کے پروگرام نہیں دیکھتا۔ ہمیں وطن سے شدید محبت ہے۔ اس لیے کبھی اسبیلی کی کارروائی دیکھنے نہیں گئے! البتہ کارروائی اخبار میں پڑھ کر ہمارا اشتقاق کئی بار مجروح ہوا ہے۔ پاکستان میں 99 فیصد لوگ محب وطن ہیں۔ باقی ایک فیصد اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ لاء اینڈ آرڈر کی صورت حال تو مغربی ممالک میں بھی ایسی ہے کہ لیبرے وہاں اس کام کے لیے اکیلے نہیں نکلتے، پاؤں بنا کر نکلتے ہیں۔ لاء اور ان لاء سے کون نہیں ڈرتا۔ روس کی ایک عدالت نے ایک شخص سے کہا: ”پور آئر! میں مانتا ہوں، تیز رفتار گاڑی چلا رہا تھا۔ کچھ خیال کریں۔ میں ممبر پارلیمنٹ ہوں۔“ تو عدالت نے تیس دن کی سزا دیتے ہوئے کہا: ”گمنورینس از نو ایکسپوز۔“ ”شخص صاحب سے کسی نے پوچھا: ”اس بار کس جرم کی وجہ سے جیل گئے؟“ کہا: ”پکڑے جانے کی وجہ سے۔“ ”جیل وہ جگہ ہے جہاں قیدی دغا مانگتا ہے کہ اسے سانپ نظر آئے تاکہ اسے مار کر آٹھ دن کی معافی لے لے۔ جس عمر کے بچوں کو گھروالے سکول سے لینے جاتے ہیں، شیخ رشید کے گھروالے اس عمر میں انہیں جیل سے لینے جایا کرتے۔ ان کی والدہ کہتیں: ”رشید اگر تم میرے بیٹے کی بجائے بنی ہو تے تو مجھے یہ پریشانی نہ ہوتی۔“ اس معاملے میں محترمہ بے نظیر صاحبہ بھی ان کی ماں کی طرح سوچتی ہیں۔ ایک مزاح نگار کہتا ہے: ”میری وجہ سے کئی لڑائیاں ہوئیں۔ میرے ماں باپ مجھے دیکھتے ہی لڑنے لگتے۔“ لیکن شیخ رشید صاحب جس دن کسی سے لڑ کر نہ آئے، تو والدہ گھبرا جاتیں کہ کہیں رشید بیمار تو نہیں۔ وہ کھلے ذہن کے بندے ہیں۔ ہر مسئلے پر کھلے ”ذہن“ سے سوچتے ہیں۔ اگرچہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں کسی نے کہا: ”اگر تم پر زمین ٹھک کر دی جائے تو کیا کرو گے؟“ تو وہ بولے: ”نیوی جاغین کر لیں گے۔“ ان کے خیال میں ہارس پاور گھوڑوں کے پاس ہی رہتی، تو بہتر تھا۔

پہلے جو لڑائی سے ڈرتا تھا، اسے بڑول کہتے تھے آج کل کنوارہ کہتے ہیں۔ سیاسی نوارے شیخ رشید آج کل بڑے محتاط ہو گئے ہیں۔ احتیاط اور بڑولی میں یہ فرق ہے کہ اگر آپ خود ڈر کر کسی کام سے ہاتھ اٹھالیں تو احتیاط ہوگی اور اگر کوئی دوسرا اس طرح کرے تو یہ بڑولی ہوگی۔ ویسے بھی جو کسی ایک بندے سے دوسری بار دھوکا کھاتا ہے، وہ اس دھوکے از کا ساتھ دیتا ہے۔ بندے کو اپنے دشمنوں سے اچھا سلوک کرنا چاہیے کیونکہ آپ نے انہیں خود بنایا ہوتا ہے۔ شیخ رشید کز دروں کی طاقت استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ ویسے کز در وہ ہے جو کم زور لگائے۔ جیل سے رہائی کے بعد سے ان کے پاؤں زمین پر نہیں نکلتے، جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ بمشکل رہا ہوئے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کے پاؤں میں جوتے ہوتے ہیں۔ چین کے رہنمائے اعلیٰ ڈینگ سیانگ کی سالگرہ پر وزارت خارجہ کے ترجمان بین جیان نے کہا: ”ان میں اس سال کم از کم ایک چینی تبدیلی آئی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ ایک سال بڑے ہو گئے ہیں۔“ ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ وہ ڈیڑھ سال بڑے ہو گئے ہیں۔

نڈان کی زبان اور عمرو از کرے۔

حکومت نے انہیں دو نئی کاریں کیا لے دیں 'اسمبلی کی 'کار' والی' 'دو کار' والی بن گئی۔ اب اتفاق سے کاروں کا رنگ سیاہ ہے۔ یوں جب بھی کوئی کسی 'سیاہ کار' کا ذکر کرتا ہے۔' اب صاحب سمجھتے ہیں ان کی بات ہو رہی ہے۔ ہمارے ایک دوست کہتے ہیں '1994ء تک ہر ایسی حادثہ نہ ہوا لیکن پھر میں نے کار خرید لی۔ لیکن نواب صاحب کو جتنے بھی حادثے میں آئے' وہ سڑک پر نہیں 'اسمبلی میں پیش آئے۔' 'بے کار' تو نواب صاحب کبھی بھی نہیں رہے، لیکن پہلے نواب صاحب کی کار کی عمر نواب صاحب جتنی ہی تھی۔ سو وہ کار میں بارے ہوئے تو لوگ تیزی سے پرے پرے ہٹ کر راستہ دیتے۔ کچھ پتہ نہ چلتا یہ نواب صاحب کی وجہ سے ہو رہا ہے یا کار سے خوف زدہ ہو کر۔ ان کی کار کی رفتار سے تو نظریہ اقبال صاحب کے شعر کہنے کی رفتار زیادہ تھی۔

بہت کم عورتیں اپنی شکل اور مرد اپنی حرکتوں سے اپنی اصل عمر کے لگتے ہیں۔ نواب صاحب بھی اپنی سیاست سے اپنی اصل عمر کے نہیں لگتے۔ پکا پتہ نہیں 'وہ کب پیدا ہوئے۔ یہ پکا پتہ ہے کہ وہ پیدا ہوئے۔ ان کی ایک ہم عمر وادکارہ ٹھیک شوگرچی تو کئی خواتین نے اسے بھی خریدنے کی کوشش کی۔ دیے بھی ان کی صرف یہ خوبی انہیں ہم سے افضل نہیں بنا سکتی کہ وہ ہم سے پہلے پیدا ہوئے۔ البتہ انہیں ہم سے بوڑھا بنا سکتی ہے۔ نواب صاحب ترکی ٹوپی میں جب ترکی یہ ترکی حقہ زنی کرتے ہیں 'تو ہم ہی کیا انہیں دیکھ کر تو بچے بھی خوش ہو جاتے ہیں۔ ہمارا تو کئی بار انہیں فریم کرانے کو دل چاہا۔ ان کے حقہ گوبشو بتاتے ہیں کشمیر سے ان کی محبت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کشمیر بھی 'کش' سے شروع ہوتا ہے۔ کچھ کے خیال میں جو بندہ حقے کو منہ لگائے اسے منہ نہیں لگانا چاہیے۔ لیکن اودھ کے دربار میں تو حقہ پینا فرائض منہ میں شامل تھا۔ یہاں تک کہ جو حقہ نہیں پیٹے تھے 'ان کے لیے بغیر تمباکو اور آگ کے حقہ لایا جاتا اور وہ اس کے منہ میں رکھ کر اپنے فرائض انجام دیتے۔ مغلیہ دور میں تو حقہ اور تمباکو نوشی کے لیے انتظام کی غرض سے ایک علیحدہ محکمہ قائم ہوا جو جہنڈا خانہ کہلاتا۔ ہم نے تو نواب صاحب کی قدرتی 'مغلیہ دور میں ہوتے تو وہ 'وزیر جہنڈا' ہوتے۔ قائد آرام نواب زادہ نواز اللہ خان صاحب زیر ساراؤ کے ہم عمر ہیں۔ زیر ساراؤ بھی کچھ نہ کرنے کے فن میں ماہر ہیں۔ کچھ کرتے ہوئے مصروف نظر آتا تو کوئی بڑی بات نہیں، لیکن کچھ نہ کرتے ہوئے



حقہ شاہی

جب سے نواب زادہ نواز اللہ خان صاحب نئی کار پر چڑھے ہیں 'لوگ یوں جج رہے ہیں جیسے کار ان پر چڑھی ہو۔ نواب زادہ نواز اللہ خان کی نئی کاریں پھر پگڑہ کی باتوں کی طرف ہمارے دوسرے گزر گئیں، لیکن لوگ نواب زادہ صاحب سے دو جوحہ کی بنا پر ناراض ہیں۔

الف۔ کار ہوتا۔

ب۔ کار ہوتا۔

اگر آپ ایگزٹ بائیں طرف سے کریں تو ایگزٹ کریں گے۔ اگر دائیں طرف سے باہر نکلیں گے تو آپ ایگزٹ نہیں کریں گے۔“ تو نواب صاحب نے بھی اگر دائیں بازو سے ایگزٹ کرنے کی کوشش کی تو ایسا ہی ہو گا۔ پھر کاروں کا حادثہ سڑک پر ہو تو بندے کے بچنے کا چانس ہوتا ہے۔ اگر اسکیلی میں ہو جائے تو صرف کاریں ہی بچتی ہیں۔ نواب زادہ صاحب جب کشمیر کمیٹی کے چیئرمین بنے تھے تو ہمیں کسی اچھی خبر کی توقع تھی، لیکن ان کی ہر خبر اس امر کی اخبار کے رپورٹر جیسی ہی نکلی جسے سمندر کے سفر پر بھیجا گیا۔ جس روز اس کا جہاز فرانس کی بندرگاہ پر نکلر انداز ہوا وہاں بڑے زور کا طوفان آیا جس سے بڑے پیمانے پر تباہی ہوئی۔ اخبار کا ایڈیٹر خوش تھا کیونکہ صرف اسی کے اخبار کا رپورٹر اس جہاز میں موجود تھا۔ وہ تار کا پے چھنی سے انتظار کرنے لگا۔ بالآخر رات گئے تار موصول ہوا جس پر لکھا تھا: ”میں بحیرہ ریت ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔“

معروف نظر آنے کے لیے ایک عمر چاہیے۔ بے نظیر بھٹو صاحب نے کہا ہے کہ مجھے سیاست سے نفرت تھی، مجبوراً سیاست میں آئی۔ سیاست میں اپنی کارکردگی سے انہوں نے یہ ثابت بھی کیا۔ ہماری سیاست کی ٹریجڈی بھی یہی ہے کہ اسے کامیابی سمجھا گیا۔ سیاست میں وہ لوگ ہیں جنہیں سیاست اچھی نہیں لگتی اور باہر وہ لوگ جنہیں یہ اچھے نہیں لگتے۔ ہینری ڈائی کی حکمرانی دراصل حکم ڈالنے ہے، جس نے نواب زادہ صاحب کو کشمیر کمیٹی کا چیئرمین بنادیا تاکہ وہ جتنے میں چندلوں کی آگ دھر سکیں۔ لوگ کہتے ہیں، رچھہ کی دوستی بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ جب وہ خوش ہوتا ہے تو گلے لگا لیتا ہے۔ بہر حال نواب صاحب نے کشمیر کمیٹی کی چیز سنی کے لیے جس کنڈیشن پر کام کیا ہے وہ ایگزٹیشن کہلاتی ہے۔ اس کمیٹی نے معاملات کو جس رفتار سے آگے بڑھایا وہی تھی جس رفتار سے نواب صاحب عقد چیتے ہیں۔ سو ممکن ہے، حکومت نے خود انہیں کاربند دی ہوں تاکہ وہ تیز روی کا مظاہرہ کر سکیں۔

ساتھ ساتھ اپنے بچوں کو گاڑی نہ چلانے دیں جب تک کہ وہ بڑے نہیں ہو جاتے، ورنہ وہ کبھی بڑے نہیں ہوں گے۔ یہ نہ ساتھ کہ بڑوں کو گاڑی لے کر نہ دیں وہ چھوٹے ہونے لگیں گے۔ لندن کی ٹریفک ایسی ہے کہ وہاں ٹریفک کے قوانین کی پابندی نہ کرو، تو حادثہ ہو جاتا ہے۔ مگر ہماری ٹریفک ایسی ہے کہ ٹریفک روٹز کی پابندی کرو تو حادثہ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ نواب صاحب عرصے سے اس بیماری میں مبتلا ہیں کہ جب ان کی آنکھیں بند ہوں تو انہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ البتہ انہیں ٹریفک کے روٹز بھاتے ہیں، بالخصوص روٹز رائس مگھوڑے اور نواب زادہ صاحب کا بڑا پرانا ”رشتہ“ ہے۔ گھوڑوں کا مسئلہ یہ ہے کہ ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ صرف اس جگہ نہیں پائے جاتے، جہاں انہیں پایا جاتا چاہیے۔ نواب صاحب کو بھی حادثے اس لیے پیش آ رہے ہیں کہ یہ وہاں نہیں پائے جاتے، جہاں انہیں ہونا چاہیے۔ ان کا یہ ہونا ہی ہونی ہے۔ ہم بحث نہیں کرتے، کیونکہ کہتے ہیں کسی کو الحق سمجھ کر اس سے بحث کرنے سے پہلے یقین کر لیں کہ وہ بھی تو یہی کچھ نہیں کر رہا۔ ہم ڈاکٹر ہیں، اس لیے نواب صاحب کو کوئی مشورہ نہیں دینا چاہیے، ورنہ وہ لوگ انہیں بیمار سمجھنے لگیں گے۔ برطانیہ کے ایک پاکستانی ڈائریور نے اپنی ٹیکسی کے بائیں دروازے پر لکھا تھا: Exist اور دائیں دروازے پر No-Exist۔ کسی نے کہا، ”بھئی صحیح Exit ہے تو اس پر پاکستانی ڈائریور بولا: ”لندن میں

شادیاں کیوں کیں؟“ بولی: ”کیونکہ میں زیادہ عرصہ تو یہاں رہی۔“ فورٹینسکی کی جب الزبتھ سے علیحدگی ہوئی تو کسی نے لاری فورٹینسکی سے پوچھا: ”اب آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟“ بولا: ”ہیر وزگار ہو گیا ہوں۔“ مشہور عالم ایلکٹرئیس گریناگاربو نے کہا تھا: ”میں کئی ڈراموں میں کئی آدمیوں کی بیوی بنی ہوں۔ میری ازدواجی زندگی کارزاری ہے کہ میں اپنے اصلی خاوند کو بھی انہی میں سے ایک سمجھتی ہوں۔“ کھر صاحب نے الزبتھ ٹیلر کی طرح جب بھی شادی کی۔ لوگوں نے کہا ”ہمیں اس شادی کی کامیابی کی بڑی امید ہے۔ کیونکہ یہ تجربہ کار دوا لہا دواہن کے درمیان ہو رہی ہے۔“ کہتے ہیں کوریامیں 34.2 فیصد مرد دیکھتے پالتے ہیں جب کہ باقی شادی کر لیتے ہیں۔ اخبارات میں مصطفیٰ کھر کے کتوں کے سیکینڈل یوں چھپ رہے ہیں جیسے کبھی موصوف کے اپنے چھپا کرتے تھے۔ کتوں کی ایسی خبریں چھپ رہی ہیں جو کانٹے کو دوڑتی ہیں۔ وزیر توانائی مصطفیٰ کھر کے ٹھکے کی توانائی ان کتوں کی صحت سے عیاں اور عریاں ہے۔ یہ درجنوں کے اعلیٰ نسل کے ہیں جب کہ یہ دعویٰ ہمارے متعدد سیاست دانوں کے بارے میں نہیں کیا جاسکتا۔ آج مختلف سیاست دان مختلف حوالوں سے مشہور ہیں۔ فاروق لغاری صاحب آرڈیننس اور قلب جاری کرتے ہیں۔ جانوروں کا وہ اتنا شکار کرتے ہیں کہ اب تو انہیں جانور بھی پہچاننے لگے ہیں، مگر بکری کا گوشت نہیں کھاتے اس سے آدی اتنا بودا ہو جاتا ہے کہ حکومت کی ہر بات اچھی لگنے لگتی ہے۔ نواز شریف کو بھی جانوروں سے بڑی محبت ہے، بشرطیکہ وہ بھینے ہوئے ہوں۔ نواب زادہ نصر اللہ خان اپنی اور بھنے کی کپ کی وجہ سے مشہور ہیں۔ آج کل حکومت نے انہیں کشمیر کمیٹی میں کپ کیا ہوا ہے۔ البتہ پنجاب کے شیر نے اب کتے پال لیے ہیں اور آج کل اسی حوالے سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ اگرچہ ہم کتوں کو گھر میں رکھنے کے خلاف ہیں کہ اس سے کتوں کے اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے اور وہ مزید کتے ہو جاتے ہیں۔ سیاست دانوں کے ساتھ کتوں کا ٹھکانا ملنا تو ہمیں بالکل پسند نہیں۔

کتے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ کچھ چار ناگوں والے بھی ہوتے ہیں۔ ”نیو انگلش ڈکسٹری“ میں سترہویں صدی کے بعد کتے کا مفہوم یہ ہے ”خوش باش آدمی“۔ ”خوش مزے کا آدمی“۔ ”یار دوست“۔ ”مغرب میں تو کتے کو دبی مقام حاصل ہو جاتا ہے، جس پر اگر وہ بیٹھتا ہے۔ الزبتھ ٹیلر کی تازہ طلاق اس لیے ہوئی کہ لاری فورٹینسکی کو الزبتھ ٹیلر سے یہ شکایت تھی کہ وہ



کتا فیم

غلام مصطفیٰ کھر صاحب کو ہم تب سے جانتے ہیں جب وہ شیر ہوتے تھے۔ اب تو کھر کی سیاست گھمڑی سیاست ہو کر رہ گئی ہے۔ بھلے وقتوں میں جب وہ سمجھتے ان کے ووٹ کم ہو رہے ہیں وہ شادی کر لیتے کیونکہ شادی میں ایک اور ایک دو نہیں ہوتا گیارہ ہوتا ہے۔ بہر حال پھر سے گھر اور اخبار میں سرخیوں لگنے لگیں۔ شادی کے معاملے میں وہ پاکستانی الزبتھ ٹیلر ہیں۔ الزبتھ ٹیلر تو اکثر یہاں رہتی ہیں۔ ایک صحافی نے الزبتھ سے پوچھا: ”آپ نے آٹھ



ورلڈ گپ

کئے کو اس سے زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ ہمیں لگتا ہے، صحافیوں کو بھی کھر صاحب سے یہ شکایت ہے کہ وہ سیاست کو کتوں جتنی اہمیت کیوں نہیں دیتے۔ ایک زمانہ تھا وہ عوام کیلئے سب کچھ قربان کرنے کیلئے تیار ہوتے تھے۔ 1990ء میں جب انہیں پتہ چلا کہ پاکستان میں 48 لاکھ لڑکیاں شادی کے انتظار میں بیٹھی ہیں تو انہیں اس وقت تک رات کو نیند نہ آئی جب تک انہوں نے اس تعداد میں ایک کی نہ کر دی۔ لیکن اب لگتا ہے، وہ پاکستان کو کوریانا بنا چاہتے ہیں۔ کوریامیں انسانوں کے مشابہ بنانے کے لیے کتوں کی پلاسٹک سرجری ہوتی ہے تاکہ کتے کی شکل دیکھ کر بتایا جاسکے کہ اس کا مالک کون ہے۔ جنوی کوریامیں کوئی کتے کو گالی دیتا ہوا پکڑا جائے تو اسے 20000 دن (کورین کرنسی 750 دن ایک ڈالر کے برابر) جرمانہ ہوتا ہے۔ وہاں تو کتوں کا جنازہ لے جانے کا رواج ہے۔ البتہ چین میں تو لوگ کتوں کو کھانے کو پرستے ہیں البتہ ہمارے ہاں کے کتے زے کتے ہوتے ہیں۔

نواب آف کالا باغ نے کہا تھا جس عہدے کے آخر میں نہ آئے اس سے ڈرو۔ جیسے گورنر، کمشنر، ڈپٹی کمشنر، سوجب کھر صاحب گورنر تھے تو لوگ ڈر کر انہیں شیر بھی نہ کہتے بلکہ چڑیا گھر کے شیر کو بھی ڈر کے مارے کھر صاحب کہہ کر بلاتے۔ وہ بھی خود کو شیر ہی سمجھتے۔ اسی لیے جب وہ اپنی حکمرانی میں ایک بار چڑیا گھر گئے تو سب سے پہلے شیرنی کے بچے کی طرف گئے۔ وہ شیر تو تھے مگر آدم خور شیر نہ تھے، خواخو شیر تھے۔ پیر پکاڑو سے کسی نے اس شیر کے بارے میں پوچھا تو وہ بولے: ”ہم اشرف المخلوقات سے رابطہ رکھتے ہیں، جانوروں سے نہیں۔“ یہ الگ بات ہے پھر صاحب کی مطلقہ بیوی نے ان کے لام بیری کی خواخو شیروں کا جو ذکر کیا ہے اس سے ہمیں وہ بھی شیر لگنے لگتے ہیں۔ لیکن جب شیر کتوں کے حوالے سے پہچانے جاسیں تو کتے شیر ہو جاتے ہیں۔

صاحب ہمارے ہاں کوڈا کرکٹ اور کرکٹ کسنگلی میں نہیں ہوتا۔ کرکٹ میں لوگوں کی دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ ہسپتال میں ہم نے ایک مریضہ سے پوچھا: ”آپ کا چھوٹا بیٹا کب پیدا ہوا؟“ تو وہ بولی: ”جب جاوید سید لانے شارجہ میں چھکا لگایا۔“ اور تو اور ہم نے اپنے دوست کی بیوی کو فون کر کے پوچھا: ”آپ کا سردر دیکھا ہے؟“ بولی: ”وہ تو اس وقت باہر کرکٹ کھیل رہا ہے۔“ بندہ کسی سے خیریت پوچھتے تو وہ سکور بتاتا ہے۔ البتہ جب سے بھارتی اوراکارہ آئندہ

جھلکا نے اعلان کیا ہے کہ جو بھارتی کھلاڑی در لڈکپ میں سب سے زیادہ سکور کرے گا، میں اس سے شادی کروں گی۔ تب سے بھارتی کھلاڑیوں کی بیویاں ڈرتے ڈرتے سکور کتنی ہیں کہ کہیں ان کا خاوند زیادہ سکور نہ کر دے۔ بھارتی کھلاڑی بھی دب کر کھیل رہے ہیں۔ ایسے ہی ایک بار اداکارہ شمیم آراء نے اعلان کیا تھا کہ میں اس سے شادی کروں گی جو کشمیر فتح کرے گا۔ کشمیر کے اب تک فتح نہ ہونے کی وجہ تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ بہر حال اسی بھانے جھلکا نے در لڈکپ میں جھلکی دکھا دی۔

اداکارائیں سمجھتی ہیں شادی ایک کھیل ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کثرت ایک کھیل ہے۔ کوئی نیا کھلاڑی ہی لوز پال اور ایسی ہی ٹاک پر آؤٹ ہو سکتا ہے جیسے کرکٹرز کو سگریٹ چھوڑنے کیلئے WILL اور نہ چھوڑنے کے لیے WILLS چاہیے، ایسے ہی اداکاراؤں کو اکثر طلاق لینے کے لیے شادی کرنا پڑتی ہے۔ اداکاراؤں اور کرکٹرز کی شادیاں ہوتی رہتی ہیں، بلکہ ہوتی ہی ہیں، رہتی کہاں ہیں۔ اداکارائیں پہلیں حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہیں، یہاں تک کہ شریف بھی بن سکتی ہیں۔ لیکن ان کی فلمیں دیکھ لو تو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ شادی اور عمر کے علاوہ کچھ چھپانے کی کوشش نہیں کرتیں۔ ہالی وڈ میں ویک اینڈ بہتر بنانے کے لیے شادی ہوتی ہے اور لالی وڈ میں فلم کا اینڈ بہتر بنانے کے لیے۔ اداکارہ دازا کیو نے آٹھ نو شادیاں کیں۔ کسی نے پوچھا: "شادی محبت کے لیے کرتی ہو، ذہنی سکون حاصل کرنے کے لیے یا سہارا حاصل کرنے کے لیے؟" بولی: "طلاق حاصل کرنے کے لیے۔" مغرب میں طلاق لینے پر بیوی کو اتنی رقم ملتی ہے کہ اب تو وہاں عورتیں اس بندے سے شادی کرتے ڈرتی ہیں جس سے طلاق لینے میں مشکل ہو سکتی ہو۔ البتہ ازبجہ ٹیلر نے اب یہ کہہ دیا ہے کہ اس کا آٹھ شادیاں کرنا غلط تھا۔ شادی ایک ہی ہونا چاہیے۔ سواب اس نے ایک شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

آتش جھلکا کے ایک ہمسائے نے بتایا کہ وہ شروع ہی سے اتنی شرمیلی تھی کہ کم از کم پانچ بار سیٹی بھانے پر ایک بار کٹی۔ ہمیں تو در لڈکپ 1996ء کے موقع پر آتش جھلکا کے بیان سے یقین ہو گیا تھا کہ وہ بڑی شرمیلی ہیں۔ اگر شرمیلے نہ ہوتی تو وہ یہ بیان 1992ء کے ورلڈکپ کے موقع پر ہی دے دیتی۔ البتہ اتنا پتہ چلا ہے کہ اسے کانگ پند ہے۔ شاید اسی

لیے شادی کرنا چاہتی ہے۔ کانگ کا کھیل شادی کی طرح ہے۔ کبھی پہلے ہی راؤٹ میں فیصلہ ہو جاتا ہے اور کبھی آخری تک لڑائی چلتی ہے۔ ایک بار مانگ ٹائی سن کے حریف نے کہا: "ڈرینگ روم رنگ سے اتنے فاصلے پر کیوں رکھا گیا ہے؟" تو مانگ ٹائی سن نے کہا: "آپ کو کیا؟ آپ نے کون سا خود چل کر جانا ہے۔" بہر حال جہاں تک آتش جھلکا کی بات ہے، اسے کھیلوں میں کرکٹ پرند ہیں۔ ہمیں تو کھیلوں سے اتنی ہی دلچسپی ہے کہ سکول کے زمانے میں گراؤنڈ میں سنٹر فار وڈ ہوئے اور کلاس میں رات بیک۔

آتش جھلکا کا لباس اس کی گفتگو کی طرح ناپاطا ہوتا ہے۔ مختصر لباس کی خانی یہ ہے کہ ہر کسی کی نظر لباس پر مختصر ہی پڑتی ہے۔ جیسے جوش ملیح آبادی کو جب کچھ نہ کہنا ہوتا تو وہ ستر ستر بندی نکلیں کہتے۔ جب بی اے لکھنا ہوتا تو چار مصرعوں کی رباعی کہتے۔ ایسے ہی جھلکا نے جب کچھ کہنا ہوتا ہے تو چپ رہتی ہے۔ عدنان سیاحی خان کی طرح معصوم چہرہ، عدنان سیاحی خان کا چہرہ تو ایسا ہے کہ فلم سرگم میں جب اپنے معصوم چہرے سے زینا اختیار کی طرف بے اختیار دیکھتے تو گیلری میں بیٹھی ہوئی عورتیں اپنے بچے گود میں لے کر سہلانے لگتیں۔ اداکارائیں اپنی شادی پر اکثر سب سے اچھی پر فارمنس دیتی ہیں، کیونکہ اس سین کی انہیں بڑی ریسرسل ہوتی ہے۔ شوکت تھانوی کی بہن کی شادی پر دوست انہیں بار بار مذاق کر رہے تھے کہ یہ لہن کا بھائی ہے۔ آخر شوکت تھانوی صاحب سے نہ رہا گیا۔ کھڑے ہوئے اور اعلان کیا کہ ہاں میں لہن کا بھائی ہوں اور ہمارے ہاں یہ رسم ہے کہ جب لڑکی بڑی ہو جائے تو اس کی شادی کر دیتے ہیں۔ حالانکہ فلم والوں میں ایسی کوئی رسم نہیں، پھر ایچے نیٹیمین ایک "رن" کے لیے نہیں بھاگے۔ اگر وہ کھلاڑیوں نے ایک سا سکور کیا تو پھر آتش جھلکا اس بنا پر فیصلہ کریں گی کہ کس کا "رن" رعیت زیادہ۔ ویسے ہمارے خیال میں اگر آتش جھلکا نے یہ پیشکش بھارت کو ورلڈکپ جتوانے کے لیے کی ہے تو اسے چاہیے تھا، یہ اعلان کرتی کہ جو بھارتی کھلاڑی سب سے کم سکور بنائے گا میں اس سے شادی کروں گی۔ اسی ڈر سے بھارتی کھلاڑی دل کھول کر سکور بناتے اور در لڈکپ جیت جاتے۔